اداریہ

۱۴ اگست

آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

یہ سطور ہم ۱۴ اگست کو سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ وہی ۱۴ اگست، جس دن ہمیں آزادی ہی نہیں ملی، نیا ملک بھی ملا — پاکستان — جس کے لیے لاکھوں جانیں گئیں، ہزاروں عصمتیں لٹیں۔ ان گنت بچے نیزے کی انی پر لٹکا دیئے گئے اور کروڑوں کی جائداد سے محروم ہونا پڑا، اس دن تبادلہ آبادی کا جو عمل شروع ہوا اس کی وجہ سے مشرقی پنجاب کا پورا علاقہ مسلمانوں کے وجود سے خالی ہو گیا، ہزاروں مساجد اور مدارس اُجڑ گئے۔ خانقاہیں ویران ہو گئیں — جی ہاں آزادی کے بعد پہلی عید اس طرح آئی کہ چاروں طرف خاک و خوُن کا سمندر اُبل رہا تھا اور اس کی بے رحم موجیں اور خونی تھپیڑے انسانیت کا منہ چڑا رہی تھیں — اور یہ ایک دن کی بات نہیں — کب سے انگریز اس ملک میں آیا اور کب سے مسلمان قربانیاں دینے لگے، یہ ایک طویل داستان ہے، دو سو سال پر پھیلی ہوئی داستان، اس میں ٹیپو سلطان، سراج الدولہ، شہدار بالاکوٹ اور شہدار ۱۸۵۷ء کی قربانیاں شامل ہیں۔

میرٹھ چھاؤنی کے فوجیوں کا عزم و حوصلہ، علمار کی داستان دار و رسن اور نہ معلوم کیا کچھ ہے، جس کو تاریخ اپنے دامن میں سمیٹ چکی ہے — اس طویل عمل کے نتیجہ میں ۱۴ اگست کا سورج طلوع ہوا لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ جو ہماری بیماریوں اور پریشانیوں کا باعث تھا اسی عطار کے لونڈے سے ہم نے دوا لینا چاہی اور اس دشمنِ جان کو مسیحا بنا کر چھوڑا۔ اس نے ہمارے جسدِ ملی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ مسلمان کی قوّت کے حصے بخرے کر دیئے۔ یوں ہمیں نئی مملکت ملی۔ تقسیم کا مرحلہ اِدھر کے قائدین کی "انا" اور اُدھر کے لیٹروں کی کم ظرفی و کم حوصلگی کے پیشِ نظر خونی لکیر ثابت ہوا، لیکن خونی لکیر عبور کر کے قافلہ در قافلہ سرحدات وطن میں آنے والے لوگوں کو کیا ملا؟ یہ ایک اندوہناک داستان ہے — اتنی اندوہناک کہ اس کے بیان کرنے کا حوصلہ نہیں۔ قلم میں تاب نہیں۔ روح ہے کہ چرکے سہہ سہہ کر جسم کا ساتھ چھوڑ دینا چاہتی ہے — ذرا دیکھیں یہاں قانون کے نام پر لاقانونیّت کا دور دورہ رہا اور ہے، رشوت و سفارش روز افزوں ہے۔ بدنظمی، بے انتظامی، انتشار اور افراتفری اپنے جوبن پر ہے۔

بدل اشتراک
سالانہ ۶۰ روپے
ششماہی ۳۰ روپے
سہ ماہی ۱۵ روپے
فی پرچہ
ڈیڑھ روپیہ

جلد نمبر ۲۴
شمارہ نمبر ۲

ہفت روزہ
خدام الدین
لاہور

۱۴ رمضان المبارک ۹۸ھ
۱۸ اگست ۱۹۷۸ء

رئیس الادارہ
پیر طریقت حضرت
مولانا عبید اللہ انور صاحب
مدیر منتظم
میاں محمد اجمل قادری
مدیر
محمد سعید الرحمان علوی
معاون
صالح محمد حضروی

پبلشر مولانا عبید اللہ انور۔ پرنٹر الٰہی بخش۔ مطبع کاسمو پرنٹرز ۴۸۰ موری گیٹ لاہور

عدل عنقا ہو چکا، ظلم کا بازار گرم ہے، انسانی عزت و جان کی بے حرمتی کا کاروبار ہر لحظہ ترقی کر رہا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے ہوٹل تعمیر کیے، بلڈنگیں بنائیں، دفاتر اور سیکرٹریٹ بسائے، لیکن علم و اخلاق کی دنیا اُجڑ گئی، تعلیم گاہیں رقص و سرود، فحاشی و بے حیائی اور قتل و ڈاکہ زنی کے اڈے بن گئیں۔ شاگردوں کے ہاتھ اساتذہ کے گریبانوں تک اٹھے اور اساتذہ نے اپنی بچیوں کی عزت سے کھیلنے میں عار محسوس نہ کی۔

معاشی و بدحالی قوم کا مقدر بن گئی۔ طبقاتی کشمکش نے نئے نویلے فتنوں کو جنم دیا۔ ایک طبقہ زر پرستی میں اندھا ہو گیا۔ دوسرا نان جویں کو ترسنے لگا۔ سچ کہنے والوں کی گردنیں ناپی گئیں اور حاکم و منصف انصاف فراہم نہ کر سکے۔ یتیموں کے آنسو کسی نے نہ پونچھے، بیوہ کے سر پر اوڑھنی کا کسی نے انتظام نہ کیا۔ اور اس کے سہاگ کو اجاڑنے والوں کو کسی نے تختہ دار پر نہ لٹکایا، محرومیاں بڑھیں اور اتنی کہ لوگ ملک کے مستقبل کے معاملہ میں مایوسی کا اظہار کرنے لگے۔ اور یہ سب ان لوگوں کے طرزِ عمل کی وجہ سے پیش آیا جو آزادی کی کلغی سر پر سجا کر بڑے بنے پھرتے ہیں۔ حادثوں کی یہ پیداوار جن کے دامن میں آزادی و حریت کے لیے کوئی قربانی نہیں، جنہیں انگریز بہادر نے اپنی ضرورتوں کے لیے جنم دیا اور بڑا بنایا، انھوں نے ملک حاصل ہوتے ہی جو دھینگا مشتی کی وہ تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔

مذہب و اخلاق سے عاری ان لوگوں نے صبح و شام پارٹیاں بدلیں۔ دینی و اخلاقی تقاضوں کو پامال کر کے ہندو، انگریز اور قادیانیوں کو کلیدی اسامیوں پر براجمان کر دیا۔ اپنی نااہلیوں کے سبب نوکر شاہی پر اعتماد کر کے اس کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ اور اپنی مکروہ خواہشات کے لیے ہر وہ کام کیا جس کی ضمیر و اخلاق اجازت نہیں دیتے۔ ان لوگوں کی سیاہ عملیوں کے پیشِ نظر سیاسی پارٹیوں کا سیلاب آ گیا۔ ایسی ایسی پارٹیاں جن کا کام تفرقہ انگیزی اور انگریزی دور کی مخصوص منافرت کو ہوا دینا تھا اور ہے —— اب بھی اس قسم کے بدنما چہرے اس مظلوم و ستم رسیدہ قوم کی قسمتوں کے مالک بنے ہوتے ہیں —— جی ہاں یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے انگریز سے لے کر یحییٰ و بھٹو کی چوکھٹ تک پہ سجدہ ریزی کی، ان تمنداروں، جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں نے ایسی ایسی مکروہ روایات کو جنم دیا جو ہماری قومی زندگی کا لازمہ بن کر رہ گئی ہیں۔ ان ستم رانیوں کے سبب ملک دولخت ہو گیا۔ لیکن ان کی حب الوطنی پر حرف نہ آیا۔ انھوں نے بھٹو جیسے بد باطنوں کی بپا کردہ کالی رات کی عمر دراز کرنے کے لیے اپنی غیرت و حمیت کو داؤ پر لگایا۔ جب بھی ان کی چودھراہٹ میں فرق نہ آیا ——

اس ذہن و قماش کے لوگوں نے سالِ گزشتہ کی فقید المثال تحریک کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے داؤ پر لگایا۔ اور جھوٹے وقار اور چند روزہ نمائش اقتدار کے لیے ملت کے اجتماعی پلیٹ فارم کو تہہ و بالا کیا۔ ۴۷ء سے لیکر ۷۸ء تک کے شہیدوں کی مضطرب روحیں ان کا ماتم کر رہی ہیں اور وہ مائیں جن کے لعل خاک و خون میں تڑپ گئے وہ ان کا منہ تک رہی ہیں —— لیکن ۳۱ سال تک وطن کی سرزمین کو بے آئین رکھنے والے یہ لوگ ہیں کہ ان کی آنکھوں کا پانی مر گیا ہے اور یہ ہر چیز سے عاری ہو چکے ہیں —— کوئی نہیں جو ان کو ملک سے نجات دلائے بلکہ ہر آنے والا انہی کو اپنے اقتدار کی بیساکھیاں سمجھ کر اپنا لیتا ہے —— یہ صورتِ حال کب ختم ہو گی یہ تو معلوم نہیں لیکن تاریخ کا پہیہ تیزی سے رواں دواں ہے۔ سنبھلنے کی ضرورت ہے، ہوش میں آنے کی ضرورت ہے اور نفاق و اتحاد کے رسیا گرگٹ نما کھوپڑیوں کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

آج ضرورت ہے درّہ فاروقی اور شمشیر خالد کی —— جو معاشرہ کی زبوں حالی کا شکار لوگوں کا قلع قمع کرے لیکن یہ کام کون کرے گا۔ تختِ اقتدار پر براجمان لوگ کوثر و تسنیم کی زبان میں دھلی ہوئی تقریریں تو کر سکتے ہیں۔ عمل نہیں کر سکتے۔ عمل کے لیے مجددی رح عزیمت، ولی اللہی رح فکر و فلسفہ اور شہدائے بالاکوٹ سے لے کر شہدائے ۴۷ء تک کے جذبہ عمل

کے وارثوں کو بیدار ہونا پڑے گا۔ انہیں اپنی صفوں کو منظم کر کے بنیان مرصوص کا روپ دھارنا پڑے گا۔ انہیں اپنی تاریخ پر ناز کرنے کے بجائے تاریخ کے ابواب خود قلم بند کرنا ہوں گے۔ اور انہیں مصلحت بینی اور سہل انگاری کے بجائے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو اپنانا ہو گا۔ اور مجاہدانہ سرفروشیوں سے تاریخ کا رُخ موڑنا ہو گا۔

قارئین کرام —— یہ جلے دل کی صدا ہے جو ۱۴ اگست کی مناسبت سے صفحہ قرطاس پر منتقل ہو گئی۔

ملک اور قوم جس نازک صورتحال سے دو چار ہے۔ اس نے ہمارے الفاظ کو تندی و تلخی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ بخدا ہمارے بس میں ہوتا تو ہم ملک کے قاتلوں، غداروں اور دین کے دشمنوں سے اندرون و بیرون ملک مذاکرات کرنے کے بجائے انہیں الٹا لٹکا دیتے کہ قوم کی بقا کا راز اسی میں ہے تاہم خدا کی رحمت سے مایوس ہوئے بغیر ایسے سفر کے لیے کمر ہمت باندھ لیں جس میں گولی لاٹھی اور نہ معلوم کیا کیا کچھ سہنا اور برداشت کرنا پڑے گا۔

قسم ہے رب ذوالجلال کی جس نے اپنے محبوب ترین بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ اگر آپ نے کمر ہمت باندھ لی تو ہر قسم کے مادی اسلحہ سے لیس رذیل الطبع لوگ آپ کے جذبہ عمل کے سامنے خاک ہو جائیں گے۔ کیونکہ خدائے بزرگ و برتر منزل کے لیے آسانیاں انہیں مہیا فرماتا ہے جو جذبہ عمل اور جوش جہاد سے سرشار ہوتے ہیں —— والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔

رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حوصلوں اور ارادوں میں برکت دے اور ہمیں اسلام کی حقیقی روح سے سرشار فرمائیں۔

علو ۱۴ اگست ۷۷

..... کے بجائے ۲۷ رمضان

عبوری حکومت کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق نے ہلال رمضان نظر آنے کے بعد اپنی ریڈیائی تقریر میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ یوم پاکستان ۱۴ اگست کے بجائے ۲۷ رمضان کو منایا جائے خواہش اچھی ہے لیکن خواہشات کا اظہار تو ہم جیسے "بے اختیار" لوگوں کو کرنا چاہیئے۔ "با اختیار لوگ" اور خواہشات بے جوڑ سی بات ہے تاہم اتنی بات ہم ضرور عرض کریں گے کہ اگر یہ تبدیلی آ جائے تو ۱۴ اگست کو "پاکستانی ذہنیت" جو مخصوص رنگ رلیاں مناتی ہے ان سے ۲۷ رمضان کو محفوظ رکھنے کا خاطرخواہ انتظام ہونا چاہیئے کہ یہ مہینہ اور پھر یہ رات بہت بابرکت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ رنگ رلیاں غضب الٰہی کا ذریعہ بن جائیں۔

حکومت بن رہی ہے

قومی اتحاد اور جنرل صاحب کا معاملہ طے ہو گیا۔ اتحاد کی بیدار مغز اور مدبر قیادت نے فلاح ملک کی خاطر اپنے فارمولا کی بنیاد پر بات منوالی۔ حلف برداری کی تقریب کا مرحلہ قریب ہے۔ تفصیلی تبصرہ پھر۔ اب تو یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ پروردگار عالم اس نئی صورت کو ملک و قوم کی بہتری کا ذریعہ بنائے۔ اور بتلائے گردش قوم سکھ کا سانس لے سکے۔

بقیہ : درس حدیث : صفحہ ۲ سے آگے

یہ بات آتی ہے کہ اللہ کا گھر مسجدیں ہر وقت اللہ کے ذکر سے معمور رہنی چاہئیں کسی وقت خدا کا ذکر کرنے والوں سے مسجد خالی نہ ہو، کسی وقت کچھ قرآن پڑھ رہے ہوں۔ ان کے پیچھے کے اوقات میں نوافل پڑھنے والے ہوں۔ کوئی نہ کوئی تلاوت کر رہا ہو۔ وہ اوراد و وظائف میں مشغول ہو اور رات کو کوئی تہجد پڑھ رہا ہو۔ مسجدیں اس لیے ہیں کہ ہر لمحہ ان میں اللہ کا ذکر ہو۔ اس لیے نہیں کہ بازار میں کہیں ملاقات کسی دوست سے ہو گئی تو کہہ دیا۔ فلاں وقت مسجد میں اذان کے وقت ہی آ جانا۔ کچھ پارٹنرشپ کے متعلق مشورہ کریں گے۔ پارٹنرشپ اپنی جگہ بالکل درست لیکن کاروباری مشورے اور معاملات مسجد میں نہیں مسجد سے باہر طے ہونے چاہئیں۔

عبادات کا عالمی موسم اور اعمالِ صالحہ کا جشنِ عام

جانشینِ شیخ التفسیر حضرۃ مولانا عبیدُ اللہ انور مدّ ظلہم

بعد از خطبۂ مسنونہ !

اما بعد !

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ ...... لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ

محترم حضرات و خواتین !

وقت و حالات کی مناسبت سے سورۂ بقرہ کی جو آیات تلاوت کی گئی ہیں۔ پہلے ان کا ترجمہ ملاحظہ فرما لیں۔

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوتے ہیں، عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔ (یہ روزے) گنتی کے چند روز کے (ہیں)۔ پھر تم سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے)۔ اور جو اسے مشکل سے برداشت کر سکیں، ان کے ذمے فدیہ ہے (کہ وہ ایک مسکین کا کھانا ہے) اور جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے، اس کے حق میں بہتر ہے' اور اگر تم علم رکھتے ہو تو بہتر تمہارے حق میں یہی ہے کہ تم روزے رکھو، ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے، وہ لوگوں کے لیے ہے اور (اس میں) کھلے ہوئے (دلائل ہیں) ہدایت اور (حق و باطل میں) امتیاز کے۔ سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے لازم ہے کہ وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے، اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو (اس پر) دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) اللہ تمہارے حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔ اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم شمار کرلیا کرو اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمہیں راہ بتا دی، عجب نہیں کہ تم شکرگزار بن جاؤ۔

آیاتِ بالا کا خلاصہ

یہ آیات جو اوپر تلاوت کی گئیں اور جن کا ترجمہ عرض کیا گیا، ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو اس قانون کے مکلف ہیں "اے ایمان والو" کے عنوان سے خطاب کیا، جس کا مقصد ایک انسان کو احکاماتِ الٰہی کی بجا آوری کے لیے تیار کرنا ہے۔ کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ جو حکم ہے اسے اپناؤ۔ چاہے وہ تمہارے نفس پر شاق و گراں ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ روزہ جو تم پر فرض کیا گیا ہے وہ مذہب کی تاریخ میں پہلی بار نہیں ہوا، بلکہ اس سے قبل بھی جو مذاہب ہو گزرے ہیں۔ ان میں برابر روزہ موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عنوان سے تعمیل حکم اور آسان ہو جاتی ہے اور ہمت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ حکم بلاوجہ و بلا مقصد نہیں بلکہ اصلاح وتزکیہ اور تربیت کے لیے ہے۔ جس کے لیے لعلکم تتقون کا عنوان اختیار فرمایا۔ کہ تمام عبادات کا مغز و نچوڑ یہی ہے۔ اس کے بعد اس کی مدت کا ذکر ہے۔ کہ محض ایک مہینہ کی بات ہے، یعنی گنتی کے چند دن جو دیکھتے دیکھتے گزر جاتے ہیں۔ اس کے باوجود مریض و مسافر کو جو عاجز و معذور ہوں مستثنیٰ کیا گیا کہ وہ دوسرے دنوں (صحت و فراغت) میں قضا کر لیں اور ایسا آدمی جس کی قوت بالکل جواب دے چکی ہو وہ فدیہ

دے کر اجر و ثواب حاصل کر سکتا ہے' پھر اس مہینہ کی فضیلت بیان کی گئی۔ کہ اس میں قرآن نازل ہوا۔ اور معلوم ہے کہ قرآن کیا ہے ؟ نسلِ انسانی کو نئی زندگی کا پیغام۔ جس کے ذریعہ انسانیت کا اُجڑا باغ پھر سے ہرا بھرا ہوگیا اور نخلِ انسانیت کے اندر ایسی بہار آگئی جس کی مثال پہلے نہ ملتی تھی۔ اور آخر میں واضح کر دیا کہ یہ اسلامی روزہ یا روحانی غذا ایسی نہیں جس میں تشدّد اور ناروا سختی ہو۔ بلکہ یہ بھرپُور زندگی ہے۔ اس میں ہر طرح کے فوائد ہیں۔ اور یہ ہر قسم کی برکتوں سے معمور ہے۔

روزہ کی فرضیّت:

روزہ جو ارکانِ اسلام میں شامل ہے، ہجرتِ نبوی کے بعد فرض ہوا۔ اور یہ وہ وقت تھا جو پروانگانِ شمع رسالت عقیدہ کی پختگی میں اپنی مثال آپ بن چکے تھے۔ ان کے رگ و پے میں ذات حق کا جلوہ نمایاں ہو چکا تھا۔ اور وہ دنیائے کفر و ضلالت کے ہر جال کو توڑ تاڑ کر اپنے ایمان و عقیدہ کی حفاظت کے لیے مثالی کردار ادا کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی نماز جیسی اہم عبادت ان کی روح کی غذا بن چکی تھی۔ تب اللہ تعالےٰ نے یہ عبادت فرض کی۔ اس کا راز بقول علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ یہ تھا کہ:

"چونکہ مالوفات و خواہشات سے انسان کو چھڑانا سب سے مشکل اور دیر طلب کام ہے۔ اس لیے اس کی فرضیت کا حکم ہجرۃ کے بعد اس وقت تک نازل نہیں ہوا جب تک اس کا اطمینان نہیں ہو گیا کہ اب توحید اور نماز ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے اور قرآنی احکامات سے ان کے دل پوری طرح مانوس ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال روزہ کا حکم آیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے قبل کے رمضانوں کے روزے رکھے۔"

روزہ کے مقاصد:

اس عنوان کے تحت مناسب ہو گا کہ بعض نامور مسلم مفکرین و اہلِ علم کی آرا، پیش کر دی جائیں۔ جن سے "روزہ کے مقاصد" اور "زندگی پر اس کے اثرات" کا آسانی سے اندازہ ہو جائے گا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نام اور کام سے ایک دنیا واقف و آگاہ ہے عالمِ اسلام کا یہ نامور مفکرؒ اپنی مشہورِ عالم کتاب "احیاء العلوم" میں لکھتا ہے کہ:

"روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اخلاق الٰہیہ میں سے ایک کا پَرتو اپنے اندر پیدا کر لے جس کو "صمدیت" کہتے ہیں۔ وہ امکانی حد تک فرشتوں کی تقلید کرتے ہوئے خواہشات سے دست کش ہو جائے۔ اس لیے کہ فرشتے بھی خواہشات سے پاک ہیں۔ اور انسان کا مرتبہ بھی بہائم اور جانوروں سے بلند ہے۔ نیز خواہشات کے مقابلہ کے لیے اس کو عقل و تمیز کی روشنی عطا کی گئی ہے، البتّہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کم تر ہے کہ خواہشات اکثر اس پر غلبہ پا لیتی ہیں اور اس کو ان سے آزاد ہونے کے لیے سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنی خواہشات کی رو میں بہنے لگتا ہے تو اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے اور جانوروں سے کے ریوڑ سے جا ملتا ہے اور جب اپنی خواہشات پر غالب آتا ہے تو اعلیٰ علیین اور فرشتوں کے آفاق تک پہنچ جاتا ہے۔"

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں:

"روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفسِ انسانی خواہشات اور عادتوں کے شکنجے سے آزاد ہو سکے، اس کی شہوانی قوتوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو اور اس ذریعہ سے وہ سعادتِ ابدی کے گوہر مقصود تک رسائی حاصل کر سکے۔ اور حیاتِ ابدی کے حصول کے لیے اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے بھوک اور پیاس سے اس کے ہوس کی تیزی اور شہوت کی حد میں تخفیف پیدا ہو اور یہ بات یاد آئے کہ کتنے مسکین ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ وہ شیطان کے راستوں کو اس پر تنگ کر دے اور اعضاء و جوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک

دے جن پر کہ دنیا و آخرت دونوں کا نقصان ہے۔ اس لحاظ سے یہ اہلِ تقویٰ کی لگام، مجاہدین کی ڈھال اور ابرار و مقربین کی ریاضت ہے۔"

تعینِ روزہ کا راز

اللہ تعالیٰ نے روزہ کے اوقات اور تعداد کا جو تعین فرمایا تو اس میں بھی ایک راز ہے، یوں بھی ہو سکتا تھا کہ اجازت دیدی جاتی اور ہر انسان اپنی مرضی و منشار کے مطابق روزے پورے کر لیتا، لیکن اس سے جو نقصانات ہوتے وہ بالکل ظاہر ہیں۔ اجتماعی زندگی زیر و زبر ہو جاتی۔ اور انسان نفس و خواہش کا غلام بن کر رہ جاتا۔ اور بقول حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ،

"روزہ میں اختیار دے دینے سے تاویل اور فرار کا دروازہ کھل جائیگا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہو جائیگا۔ اور اسلام کی یہ سب سے بڑی اطاعت غفلت کا شکار ہو جائے گی۔

مزید فرماتے ہیں کہ:

"اس کی (مدت کی) تعین بھی ضروری تھی۔ تاکہ اس میں افراط و تفریط کا موقع نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی اس پر اتنا عمل کرتا کہ جس سے اس کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا اور کوئی اثر مرتب نہ ہوتا اور کوئی اتنا غلو سے کام لیتا اور اتنی کثرت کرتا کہ اس کی ناطاقتی اور کمزوری حد کو پہنچ جاتی۔ اور وہ نیم مردہ ہو کر رہ جاتا۔ اصل میں روزہ وہ تریاق ہے جو نفس کے زہر کو مارنے کے لیے مہیا کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں ضرورت کی رعایت ضروری ہے۔"

غذا کی تقلیل:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تقلیلِ غذا کا تجزیہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"اس کے دو طریقے ہیں یا تو یہ کہ خوراک کی مقدار کم کر دی جائے۔ یا کھانوں کے درمیان وقفہ اتنا طویل کر دیا جائے تاکہ یہ مقصد پورا ہو سکے۔ شریعت نے یہی آخری صورت اختیار کی۔ اس لیے کہ اس سے بھوک اور پیاس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے جو اپنی خواہشات پر چوٹ پڑتی ہے اور محسوس طور پر نظر آتا ہے کہ اس میں کمی آئی ہے۔"

روزہ اور رمضان

اس عبادت کو اس مخصوص مہینہ کے ساتھ مخصوص کرنے کا راز کیا ہے؟ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ مکتوبات میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اس مہینہ کو قرآن مجید کے ساتھ بہت خاص مناسبت ہے اور اسی مناسبت کیوجہ سے قرآن مجید اس میں نازل کیا گیا۔ یہ مہینہ ہر قسم کی خیر و برکت کا جامع ہے۔ آدمی کو سال بھر میں مجموعی طور پر جتنی برکتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ اس مہینہ کے سامنے اسطرح ہیں جس طرح سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ۔ اس مہینہ میں جمعیت باطنی کا حصول پورے سال جمعیت باطنی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور اس میں انتشار اور پریشان خاطری بقیہ تمام دنوں بلکہ پورے سال کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جن سے یہ مہینہ راضی ہو کر گیا، اور ناکام و بدنصیب ہیں وہ جو اس کو ناراض کر کے ہر قسم کی خیر و برکت سے محروم ہو گئے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں آپ فرماتے ہیں کہ:

"اگر اس مہینہ میں کسی آدمی کو اعمالِ صالحہ کی توفیق مل جائے تو پورے سال یہ توفیق اس کے شاملِ حال رہے گی۔ اور اگر یہ مہینہ بے دلی، فکر و تردد اور انتشار کے ساتھ گزرے تو پورا سال اسی حال میں گزرنے کا اندیشہ ہے۔"

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ سوسائٹی پر روزہ کے اثرات کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور مختلف جماعتوں کا ایک وقت میں ایک چیز پر اجماع اور اجتماع جس میں سب ایک

دوسرے کو دیکھتے ہیں، روزہ کو ان کے لیے آسان بنادیتا ہے۔ اور اس سے ان کی بہت ہمت افزائی ہوتی ہے۔"

"اسی طرح ان کی یہ اجتماعیت خواص و عوام دونوں کے لیے ملکوتی برکتوں کے نزول کا باعث ہے۔ اس میں اس کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے کہ ان کے کاملین پر جو انوار نازل ہوں وہ ان سے نیچے والوں کو بھی فیضیاب کرتے جائیں اور ان کی دعائیں ان کے پیچھے والوں تک پہنچتی رہیں۔"

مقصد میں کوتاہی

جب انسان خواہشات کا پجاری بن جاتا ہے تو عبادات پر عادات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر عبادت کے حکمۃ فوائد سے محروم ہو جاتا ہے۔ روزہ کے ضمن میں کبھی اس بات کا بطورِ خاص لحاظ رکھنا ضروری ہے، امام غزالیؒ نے اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"پانچواں ادب یہ ہے کہ افطار کے وقت حلال غذا میں بھی احتیاط سے کام لے اور اتنا نہ کھائے کہ اس کے بعد گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اس لیے کہ حلق تک بھرے ہوتے پیٹ سے بڑھ کر بری کوئی چیز اللہ کے نزدیک نہیں ہے، اگر روزہ دار افطار کے وقت دن بھر کی تلافی کر دے اور جو دن بھر کھانے والا تھا وہ اس ایک وقت میں کھالے تو دشمنِ خدا (شیطان) پر غالب آنے اور شہوت کو ختم کرنے میں روزہ سے کیا مدد ملے گی؟ یہ عادتیں مسلمانوں میں اتنی راسخ اور عام ہو چکی ہیں کہ رمضان کے لیے بہت پہلے سے سامانِ خوراک جمع کیا جاتا ہے اور رمضان کے دنوں میں اتنا اچھا اور نفیس کھانا کھایا جاتا ہے، جو اور دنوں میں نہیں کھایا جاتا۔ روزہ مقصود تو خالی پیٹ رہنا اور خواہشاتِ نفس کا دبانا ہے تاکہ تقویٰ کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ اب اگر معدہ کو صبح سے شام تک کھانے پینے سے محروم رکھا جائے، اور شہوت اور بھوک کو خوب امتحان میں ڈالنے کے بعد انواع و اقسام کے کھانوں سے پیٹ بھر لیا جائے تو نفس کی خواہشات اور لذتیں کم نہ ہوں گی اور بڑھ جائیں گی بلکہ ممکن ہے کہ بہت سی ایسی خواہشات جو ابھی تک خوابیدہ تھیں وہ بھی بیدار ہو جائیں۔ رمضان کی روح اور اس کا راز ان طاقتوں کو کمزور کرنا ہے جن کو شیاطین اپنے وسائل کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ بات تقلیل غذا ہی سے حاصل ہو گی۔ یعنی یہ کہ شام کو اتنا ہی کھائے جتنا اور دنوں میں کھاتا تھا۔ اگر کوئی دن بھر کا حساب لگا کر ایک ہی وقت میں کھالے تو اس سے روزہ کا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔"

"بلکہ یہ بھی آداب میں داخل ہے کہ دن میں زیادہ نہ سوئے تاکہ بھوک پیاس کا کچھ مزہ معلوم ہو۔ قویٰ کے ضعف کا احساس ہو، قلب میں صفائی پیدا ہو، اسی طرح ہر شب کو اپنے معدہ کو اتنا ہلکا رکھے کہ تہجد اور اوراد میں مشغولی آسان ہو، اور شیطان اس کے دل کے پاس منڈلا نہ سکے، اور اس صفائی قلب کی وجہ سے عالم قدس کا دیدار اس کے لیے ممکن ہو۔"

خلاصۂ کلام یہ ہے

جس کو ہم نے خطبہ کا عنوان قرار دیا کہ رمضان کا مہینہ "عبادات کا عالمی موسم اور اعمال صالحہ کا جشنِ عام" ہے۔ لیکن اس کے فوائد تب ہی مرتب ہوں گے جب آدمی تمام آداب کا لحاظ کرے، اور ان کی رعایت برتے۔ سحری افطاری کے اوقات میں حلق تک پیٹ بھر لینا اور ان کے اہتمام میں نمازوں کو قضا کر دینا یا سرے سے چھوڑ دینا، جھوٹ، غیبت، چغلی، سینما، تاش وغیرہ میں مشغول رہنا ایسی قباحتیں ہیں جن سے یہ نیکی کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔

دن میں کمال احتیاط سے روزہ اور رات میں غایت درجہ خشوع و خضوع سے قیام و تراویح قدرت کا عطیہ اور اس کی توفیق پر منحصر ہے۔

اللہ ربّ العزّت ہمیں روحِ رمضان سے بہرہ ور فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

"مادرِ مومنین و مومنات"

از :- ابوعلی فاروق ، کراچی

اللھم الرفیق الاعلیٰ - اللھم الرفیق الاعلیٰ - یہ الفاظ زبان مبارک پر تھے - سر اقدس سیّدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ٹکا ہوا تھا - جس وقت روحِ انور آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جسم اطہر سے پرواز کی -

اللہ اللہ حضرت عائشہ رضؓ کا کیا مقام ہے ، کیا رتبہ ہے کہ بوقتِ وصال آپ کا سر ان کی گود میں ——— اور وصال سے تھوڑی دیر پہلے آپؓ (ام المومنین) نے اپنے دانتوں سے مسواک کو نرم کیا اور حضورؐ نے اس سے مسواک فرمائی - اور پھر یہی نہیں - وہی حجرۂ مبارک جس میں حضرت عائشہ رضؓ کا قیام رہتا تھا - آنحضور تغسیل و تکفین کے بعد وہیں دفن ہوئے -

آج یہ حجرہ گنبدِ خضراء ——— دیارِ حبیب اور روضہ مبارک کے نام سے موسوم ہے اور دنیا بھر کی تمناؤں اور توجہات کا مرکز ہے ام المومنین رضؓ اسی مدفنِ رسولؐ میں مقیم رہی تھیں ——— پھر ذرا محبت و التفات کی شدت دیکھئے کہ بعد وصال کافی عرصہ تک اپنے محبوبؐ کی قربت میں رہیں اور محافظت کے فرائض انجام دیتی رہیں - یہاں تک کہ جب فاروقِ اعظم حضرت عمر رضؓ کو حضورِ اکرمؐ کے روضہ میں شرف سکونت بعد وصال حاصل ہوا - تو آپؓ پھر متصل جگہ پر قیام پذیر ہو گئیں -

حضرت عائشہ کون ؟ امت کی ماں ———

پیغمبرؐ خدا کی زوجۂ محبوب - لیکن جن کے متعلق عام مسلمانوں کو اندھیرے میں رکھا گیا - کوشش یہ کی گئی کہ رسولؐ خدا کی ازواج کی زندگی کے مظاہر سے مسلمانوں بالخصوص مسلمان خواتین آگاہ نہ ہونے پائیں - اگر ایسا ہوا تو یہ عظیم خواتین مسلم خواتین کے لیے آئیڈیل بن جائیں گی - یہودی ذہن کو یہ قطعی منظور نہیں - آپ دیکھیں گے کہ آپ کے قومی اخبارات فلم ایکٹرسوں کی تصاویر اور ان کی زندگی کے حالات بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں - اگرچہ آپ مسلمان ہیں ——— آپ کی آئیڈیل یہ فلم ایکٹرسیں ہیں ——— ناچنے والیاں ہیں ——— گانے والیاں ہیں ، اور اپنے جسم کی نمائش کرنے والیاں ہیں ——— آپ بڑے شوق سے ان واقعات کو پڑھتے ہیں / پڑھتی ہیں - یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ یہودی خفیہ ہاتھ آپ کے درمیان میں ہے - اور مسلمان کے بھیس میں ہے وہ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے حقیقت میں یہ لوگ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے نام سے ہی الرجک ہیں ان کے کسی مذہبی جلسہ میں جریدہ میں ، اخبار میں حضورؐ کی ازواج کا ذکر نہیں ملے گا - اور یہی لوگ ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں ، تاکہ ان کی اسٹریٹجی کامیاب رہے -

بہرحال یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا -

۱۷ رمضان المبارک کو آنحضورؐ کی زوجہ مبارکہ نے اس دنیائے عارضی سے پردہ کیا - ہر سال اس دن بعض اہل جرأت اور اہل کردار اخبارات کوشش کرتے ہیں کہ اس خاتونِ جنت کی سوانح کو شائع کرکے مسلمانوں کی معلومات میں اضافہ کریں بالخصوص مسلمان خواتین ان کے بارے میں جان کر اپنی نشانِ منزل کا تعین کریں -

میرے دوستو اور بہنو! یہ پیغمبرِ خدا کی وہ محبوب بیوی تھیں کہ جن کے متعلق سرکارِ دو عالمؐ کو عالمِ رویا میں عقد کی بشارت دی گئی - اور جبریل امینؑ نے تکرار کے الفاظِ بشارت ادا کیے - یہ بشارت اس بات کی دلیل ہے کہ شمس و قمر کا یہ حسین امتزاج صاحبِ لوح و قلم کی مشیّتِ مخصوصہ کے تحت میں آیا -

آپؓ کم و بیش نو سال تک رفاقتِ رسول اللہ سے فیضیاب رہیں آپ کا عہدِ رفاقت بے شمار درخشاں واقعات و فضائل سے پُر ہے - جس کا ہر گوشہ مسلمان خواتین کے لیے مشعلِ راہ ہے -



حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی کی یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی تھی ۔ ادارۂ خدام الدین آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ ہدیۂ قارئین کر رہا ہے ۔

دیوبند ہماری راجدھانی دہلی سے اکیانوے میل کی مسافت پر شمال مشرق کی جانب ضلع سہارنپور میں ایسٹرن ریلوے لائن پر واقع ہے۔ دیوبند کے شمال میں سہارنپور، جنوب میں مظفرنگر، مشرق میں بجنور اور مغرب میں کرنال ہے۔ اس کے مشرقی پہلو میں دریائے گنگا کی تیز دھارائیں اس ملک کی قدامت و عظمت اور تقدس کی یاد تازہ کر رہی ہیں اور مغربی گوشہ میں دریائے جمنا کی سبک گام لہریں گزرے ہوئے زمانہ کے بھولے ہوئے سبق یاد دلا کر چشم عبرت کو دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔

اس قصبہ کو دارالعلوم کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت حاصل ہے جو اسلامی علوم و فنون کی عظیم الشان بلکہ بعض حیثیتوں سے لاثانی یونیورسٹی ہے۔

۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ بمطابق ۳ر مئی کو اس مرکز علماء کا افتتاح ہوا اور قصبہ کے چند روشن ضمیر اور برگزیدہ شخصیتوں کے مشورے اور تعاون سے یہ درس گاہ جو آگے چل کر ایشیاء کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکنے والی تھی وجود میں آئی۔

دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم، اسلامی دنیا کے روحانی پیشوا اور جنگِ آزادی کے مقدس رہنما "اسیرِ مالٹا" شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے۔ موجودہ ہندوستان کی تاریخ میں شیخ الہند کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ملک کو انگریزی اقتدار کے جبر و استبداد سے نجات دلانے کے لیے شیخ مرحوم کے کارنامے آزادی ہند کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھے جائیں گے۔

حب الوطنی کے جرم میں آپ مالٹا میں پانچ سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے اور ۲۰ھ میں رہا ہو کر واپس آئے تو آزادی کی جدوجہد میں تن من دھن کی بازی لگا دی۔ مردانہ وار میدان جنگ میں کود پڑے اور گاندھی جی کے ساتھ مل کر اہل وطن کے دلوں میں آزادی کی لگن پیدا کی اور پورا ملک جوش و خروش، ولولہ و ایثار کے نعروں سے گونج اٹھا۔

آپ ہی کی قیادت میں اسی دہلی میں وہ تاریخی فتویٰ مرتب کیا گیا جس میں انگریز فوج کی ملازمت کو ناجائز کہا گیا۔ جس کے نتیجے میں آپ کے شہرۂ آفاق شاگرد مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، علی برادران اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا اور ان رہنماؤں کو سنگین سزائیں دی گئیں۔

جن اکابر نے دارالعلوم کی بنیاد رکھی تھی وہ ۵۷ء کی جنگِ آزادی میں زبردست حصہ لے چکے ہیں۔ انہیں بزرگوں کی تربیت کا اثر تھا کہ دارالعلوم کو شیخ الہند جیسے طالب علم میسر آئے۔

شیخ الہندؒ کے حلقۂ تلامذہ میں سید حسین احمد مدنیؒ کے علاوہ بعض دوسرے نامور شاگردوں اور جانبازوں کے نام بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ مثلاً مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا سیف الرحمٰنؒ، مولانا منصور محمد میاں انصاری، مولانا مفتی کفایت اللہؒ۔ ان حضرات

لئے اجنبی اقتدار اور تسلط سے وطنِ عزیز کو آزاد کرانے میں جو حیرت انگیز خدمات انجام دیں کتاب آزادی کے ایک ایک ورق پر ان کی چمک موجود ہے۔ میدانِ جنگ کے تمام شہسوار براہِ راست اسی دارالعلوم کے دامنِ فیض سے وابستہ تھے۔ اور اس درسگاہ سے انھوں نے یہ سبق سیکھا تھا۔

ہندوستان میں ملکی حکومت کے زوال سے پہلے اگرچہ پورے ملک میں عربی مدرسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں بڑے بڑے شہروں کے تقریباً تمام مدرسے تباہ ہو گئے تھے اور فضا پر بھیانک قسم کی مایوسی چھا گئی تھی، ان حالات میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے آزمودہ کار نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا اور اسلامی علوم و فنون کے احیاء کے لیے دینی درسگاہوں کے قیام کی داغ بیل ڈالی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو درس گاہ وجود میں آئی وہ یہی دارالعلوم ہے۔ دارالعلوم کے وجود میں آنے سے پہلے مدرسوں کی عام ضرورتیں پورا کرنے کا ذریعہ بادشاہوں اور امیروں کی داد و دہش اور بڑی بڑی جاگیریں ہوتی تھیں جو اس مقصد کے لیے مخصوص کی جاتی تھیں۔ لیکن دارالعلوم کے قیام کا زمانہ سلاطین و امراء کی تباہی اور در در کی خاک چھاننے کا زمانہ تھا، ان کے محلات جھونپڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے اور ان میں بہت سے نانِ شبینہ تک کے محتاج ہو گئے تھے، اس لیے قدرتی طور پر اکابر دارالعلوم نے عوام کی جانب اعانت کا ہاتھ بڑھایا اور مدرسہ کی ضرورتیں غریب عوام کے چندہ سے پوری کی گئیں۔

قومی چندے کی یہ پہلی تحریک تھی جو دارالعلوم کے قیام مبارک سے عمل میں آئی۔ چنانچہ بعد کو یہ تحریک نہ صرف دارالعلوم کے لیے بلکہ عام قومی اداروں کے لیے بیحد مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور دارالعلوم کے قیام کے متصل ہی مدارس دینی جاری ہونے لگے۔ دارالعلوم کو قائم ہوتے ابھی چند ہی مہینے ہوتے تھے کہ خاص سہارنپور شہر میں مظاہرالعلوم کے نام سے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا، اسی طرح مراد آباد اور بعض دوسرے شہروں میں متعدد دینی اور علمی درسگاہیں قائم ہو گئیں۔ عام قومی چندے کی ترکیب کی دلپذیری ہی کا یہ اثر تھا کہ اس کا تجربہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں بھی کیا جانے لگا۔

چنانچہ دارالعلوم کے قیام کے آٹھ سال بعد ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج بھی اسی اصول پر قائم کیا گیا۔ پھر چلتے چلتے اس کا تجربہ عام ہوتا گیا۔ ہمتیں بڑھتی گئیں اور اسی وقت سے بے شمار قومی و ملی اداروں کی بقا اسی اصول کی رہینِ منت ہے ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم ایک چھوٹی سی مسجد میں اس شان سے وجود میں آیا تھا کہ اس کا کل عملہ صرف ایک استاد "محمود" اور ایک شاگرد "محمود" پر مشتمل تھا۔ نوّے سال کے بعد آج بھی یہی دارالعلوم ہے۔ جس کی عظمت کے سامنے پورا ایشیا جھکا ہوا ہے۔ جس میں نہ صرف ہندوستان بلکہ بدخشاں، قندھار، ختن، تاشقند، سمرقند، ملایا، آسام، برما، انڈونیشیا، جنوبی افریقہ، نیپال، مشرقی اور مغربی پاکستان کے کم و بیش ایک ہزار پانچ سو طلباء ہیں جن کے کھانے، کپڑے اور علاج وغیرہ کی تمام سہولتیں دارالعلوم کی جانب سے پوری کی جاتی ہیں۔ جہاں تک رہنے سہنے اور کتابوں وغیرہ کی ضرورتوں کا تعلق ہے دارالعلوم ہر طالب علم کے لیے خواہ وہ امیر ہو یا غریب پڑھنے کی تمام کتابیں مہیا کرتا ہے اور کسی معمولی فیس کے بغیر ان کی رہائش کا بھی معقول بندوبست کیا جاتا ہے۔ ان دنوں دارالعلوم کا بجٹ تقریباً پانچ لاکھ روپے سالانہ ہوتا ہے اور یہ رقم اہلِ خیر کے عطیوں سے جمع کی جاتی ہے دارالعلوم کے نظامِ کار کو چلانے کے لیے بیس شعبے ہیں۔ ہر شعبے کا مستقل عملہ ہے اور عملہ ناظمِ شعبہ کے سامنے جوابدہ ہے۔

بڑے بڑے شعبوں کے نام یہ ہیں:۔ تعلیم، افتاء، تبلیغ، نشرواشاعت، کتب خانہ، محاسبی، مطبخ، اوقاف، تعمیرات، تنظیم، صنعت و حرفت، صفائی، دارالاقامہ، خوشخطی، محافظ خانہ، جمعیۃ طلباء، طب و حکمت، اہتمام اور متفرقات۔

شعبۂ تعلیم میں انتظامی کارکنوں کے

علاوہ کم سے کم چالیس پچاس یہ اساتذہ مشغول تدریس رہتے ہیں۔ اور تمام علوم و فنون مادری زبان میں پڑھاتے ہیں۔

یہ دارالعلوم ہی کا فیض ہے کہ آج ہمارے ملک کے وزیر اعظم نے تاشقند، سمرقند اور عشق آباد ایسی زبانیں تقریر کی جو ہمارے ملک کی ایک زبان ہے۔ صورت یہ ہے کہ ان علاقوں کے علماء دارالعلوم سے ہی تعلیم پا کر گئے تھے۔ انھوں نے یہاں رہ کر یہ زبان سیکھی اور اس میں تعلیم حاصل کی۔

۱۹۵۱ء میں ہندوستانی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد دارالعلوم کے معائنے کے لیے تشریف لائے، یہاں انھوں نے جو تقریر کی اُن کے ان جملوں پر تقریر ختم کرتا ہوں۔

"کسی جماعت کی زندگی اس پر موقوف ہوتی ہے کہ اس کی رُوح اور دل کو تیار کیا گیا ہو۔ آپ کی یہ درس گاہ دراصل ایسا کارخانہ ہے جو مسلمانوں کی رُوح کو ڈھالتا ہے۔ یہ کارخانہ قائم ہے تو ہمیں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ اس درسگاہ کے اسلاف نے عمل کا جو نمونہ پیش کیا تھا اور جن مقاصد کیلئے یہ درس گاہ قائم کی گئی تھی اگر وہ روشنی آپ کی رہنمائی کر رہی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شاندار مستقبل اس کے لیے تیار ہے"۔ — (نشریہ آل انڈیا ریڈیو)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

ہوں مِرے ماں باپ قرباں اس مقدس نام پر
عائشہؓ کے سینکڑوں احسان ہیں اسلام پر
جس کی عفّت کی گواہی دی کلام اللہ نے
جس کی غیرت کے نشاں ہیں دامنِ ایام پر
جس کو بخشا تھا پیمبرؐ نے "حمیرا" کا لقب
مہر و مہ کی رونقیں قربان اُسکے نام پر
جس کے فرزندوں نے سیلِ بے کراں کے روپ میں
اپنی سطوت کے عَلَم لہرائے رُوم و شام پر
جس پہ باندھا تھا خدا کے دشمنوں نے اتہام
آج تک انسان شرمندہ ہے اس الزام پر
سیّدالکونین کی سیرت کا نُورانی ورق،
جیسے صیقل جگمگاتی ہو دلِ صمصام پر
ہم گنہ گاروں کا شورش! کون ہے اُنکے سوا
خواجۂ کونین کی رحمت ہے خاص و عام پر

شورش کاشمیری

قطبِ عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کا مرض اور وصال

ذیل کی تحریر مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی سابق نائب مہتمم دارالعلوم کے قلم سے ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے قدیم کاغذات سے دستیاب ہوئی۔ اس میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے مرض الوفات اور وفات وغیرہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ تحریر اب سے ۸۰ سال پہلے یعنی ۱۳۲۳ھ کی ہے۔ مگر ایک تو حضرت گنگوہیؒ کے آخری حالات زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرے اس کے لکھنے والے حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحبؒ ہیں۔ تحریر بہت شکستہ قلم سے تھی مگر ماہانہ دارالعلوم دیوبند کے ذمہ دار حضرات نے اسے کافی محنت کے بعد قابلِ اشاعت بنایا، اب یہ وہیں سے قلم بند کی جا رہی ہے۔ ——— (ادارہ) ———

قطبِ عالم خاتم الفقہاء والمحدثین مجدددین حضرت مولانا قدس سرہٗ العزیز کے وصال کے بعد ہی سے یہ خیال دل میں مرکوز تھا کہ حضرۃ مولانا کے مرض اور وفات کے صحیح حالات مختصر طور پر لکھ کر بذریعہ اخبارات شائع کر دیئے جاویں تاکہ ان دلدادگان و وابستگان و عقیدتمندانِ مولانا کے لیے جو اقصائے ممالک میں منتشر ہیں اور جن کو اصلاً کسی قسم کی اطلاع مرض وغیرہ کی نہیں ہوئی، بلکہ دفعتاً خبرِ وصال سن کر حیران و ششدر رہ گئے اور اب وہ نہایت اضطراب کے ساتھ حالاتِ مرض و وفات سننے کے منتظر ہیں، کسی قدر باعثِ تسکین ہو سکیں۔ اور نیز عامہ مسلمانانِ ہند جو بلا اختلاف علی قدر المراتب مولانا کے اہلِ کمال بلکہ خاتم اہلِ کمال ہونے کو تسلیم کیے ہوتے ہیں، صحیح حالات معلوم کر کے فائدہ اخروی حاصل کر سکیں۔

مگر اس حادثہ نمونۂ قیامت نے طبیعت کو اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ کسی طرف متوجہ ہو سکے یا قلم اٹھا سکے، اسی لیے باوجود ضرورت و تقاضائے احباب اتنا زمانہ لیت و لعل میں گزر گیا اور کچھ نہ ہو سکا۔ اسی اثناء میں بعض بعض اخبارات کے اندر کچھ کچھ حالات شائع ہوئے جو غیر کافی ہونے کے ساتھ پورے صحیح بھی نہ تھے۔

یہ حال دیکھ کر طبیعت کو مجبور

گیا اور جو کچھ بن پڑا ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں لکھ کر پیش کرتا ہوں کیونکہ اس مضمون میں عبارت نہ مقصود ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

حضرت مولانا کی سوانح عمری ترتیب دیئے جانے کا خیال عام طور پر لوگوں کے قلوب میں جوش زن ہے اور ہر سمت یہی تقاضا ہے کہ بہت جلد سوانح لکھی جائیں، اخبارات کے ذریعہ بھی یہی صدائیں کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت ضروری کام ہے۔ قدیمی طریقہ بھی یہی ہے۔ تمام قدماء اہلِ اسلام کے حالات مدوّن کیے گئے ہیں، جن سے پچھلوں کو ہر قسم کی ہدایت و رہنمائی ہوتی ہے۔

ادھر حضرت مولاناؒ کے خواص اور حضرت صاحبزادہ والا شان جناب مولانا حکیم مسعود احمد صاحب کا ارادہ بھی یہی ہے کہ لکھے جائیں اور جلد لکھے جائیں، لیکن یہ کام نہ ایسا مختصر ہے کہ ایک دو روز یا دو ہفتہ میں ہو جائے، نہ ایک دو شخص سے ہو سکتا ہے، بلکہ یہ ایک جماعت کا کام ہے کہ تمام حالات کو جمع کر

کے شائع کیا جائے ، اسی لیے میں زندگی کے حالات کے متعلق کچھ نہ لکھوں گا۔

ناظرین ان مختصر اور صحیح حالات کو ملاحظہ فرما کر معلوم کر لیں گے کہ جس طرح حالتِ حیات میں مولانا کا ہر فعل ، ہر حرکت و سکون، نشست و برخاست ، قابلِ اقتدار اور نمونہ معاشرہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور خالص تعلیم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پوری طرح مطابق تھا اسی طرح مرض و وفات کے تکالیف اور شدائد میں بےنظیر استقامت ، پابندیٔ سنن و مستحبات، توجہ الی اللہ و انقطاع عما سواہ نے خلق کے لیے ہدایت و اقتدار کا راستہ بتلا دیا۔

کچھ عرصہ حضرت مولانا پر رغبت عالمِ قدس و مضمون من احبّ بقاء اللہ الخ۔ اس قدر غالب تھا کہ تمام چیزوں سے یکسوئی اور دل برداشتگی معلوم ہوتی تھی۔ قدیم سے عادتِ شریفہ کہ بہت کم کوئی بات بالتصریح فرمایا کرتے تھے بلکہ اشاروں میں اکثر مضمون ادا ہوتے تھے۔ اسی طرح اس مضمون کے متعلق بھی بالتصریح کہیں کچھ نہیں فرمایا۔ مگر مختلف تقریروں اور اندازوں سے خدّام اور حاضر باش مخلص اور دارِ فانی سے کلیتہً قطع تعلق و نفرت اور اس عالم کی طرف شوق و رغبت سمجھتے تھے اور دل میں کھٹکا پیدا ہوتا تھا کہ یہ کیا مضمون ہے ، نذریں بہت کم قبول فرماتے اکثر باصرار رد فرما دیتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ دل گھبراتا ہے، کیسا ہی لذیذ اور خوشگوار کھانا سامنے آتا بالکل بے ذائقہ معلوم ہوتا ، اکثر مخلص طرح طرح کے کھانے پکا کر بھیجتے مگر حضرۃ بہت ہی کم کچھ تناول فرماتے

اس زمانہ میں اکثر لوگوں کو جو دُور دراز سے بقصدِ بیعت حاضر ہوتے انکار فرما دیا ، بلکہ بعض کے اصرار پر یہ بھی فرما دیا کہ میں بھی چاہتا ہوں ، مگر حق تعالیٰ کی مرضی نہیں۔ مجلس میں اکثر وقت خاتمہ بالخیر اور دنیا کی بے ثباتی کا ذکر رہتا ، غرض ہر انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس عالم کے ساتھ کچھ بھی علاقہ باقی نہیں۔ ہمہ تن ادھر ہی متوجہ ہیں۔ مجھے اس وقت یہ مقولہ یاد آتا ہے، جو حضرت مولانا کے ایک جلیل القدر خلیفہ ہیں چھ سات ماہ ہوتے ارشاد فرمایا تھا کہ " حضرت مولانا کا اس عالم کے ساتھ سوا اس کے کچھ علاقہ نہیں معلوم ہوتا کہ مخلوق کے لیے اضافۂ رحمتِ الٰہی کا واسطہ ہیں ، اس بات کے علاوہ اس عالم سے کچھ مناسبت نہیں۔

مرضِ وفات سے تقریباً بیس روز پہلے یہ قصہ پیش آیا کہ حضرت مولانا اخیر شب میں خشکی ہو جانے کی وجہ سے حجرۂ شریفہ کے اندر تشریف لے گئے اور صبح کی نماز کے لیے وقتِ مقررہ پر باہر تشریف لائے۔ ایک خادم نے جو باہر کھڑے تھے عرض کیا کہ حضرت آپ کا کرتہ خون میں آلودہ ہے، یہ خبر مسجد میں بھی پہونچی ، اکثر خدّام سراسیمہ حاضر ہوتے دیکھا تو کرتہ کو بہت سا تازہ خون لگا ہوا ہے۔ مگر چونکہ حضرت کو اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا کہ یہ خون کہاں سے آیا ، ادھر نماز کو دیر ہوتی تھی۔ اس کی زیادہ تحقیق نہ کی گئی۔ دوسرے کپڑے بدل کر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتی ، بعد نماز دیکھا گیا تو مصلّیٰ روئی جس پر آپ بیٹھے تھے ، خون میں آلودہ ہے ، بلکہ نیچے تک خون پہونچا ہوا ہے اور دیکھا تو بائیں پیر کی دو انگلیوں خنصر بنصر میں ناخنوں کے برابر سے کچھ خون نکلتا معلوم ہوا اور کچھ نشان بھی معلوم ہوا ، جس سے یہ بات محقق ہو گئی کہ بدن میں سے خون نکلا ہے لوگوں کی رائیں مختلف ہوئیں ، کسی نے کہا کہ رگ کا منہ کھل کر خود بخود خون نکلا ہے ، کسی نے کہا کہ چوہیا نے کاٹ لیا ہے ، مگر حضرۃ مولانا نے ان میں سے کسی بات پر تیقن ظاہر نہیں فرمایا ، بلکہ کبھی کبھی تبسم کے ساتھ یہ فرمایا کہ فلاں فلاں کا یہ خیال ہے کہ چوہیا نے کاٹ لیا ہے۔

غرض اور کسی طرف لوگوں کا گمان نہیں ہوا ، انگلی پر پانی کا کپڑا باندھ دیا گیا ، صرف اس روز خون نکل جانے کی وجہ سے بدن میں انکسار و ضعف زیادہ رہا۔ دو چار روز کے بعد اسی

پیر کے ٹخنے کے اوپر کچھ خفیف سا نشان زخم کا معلوم ہوا، جس میں تکلیف کچھ نہ تھی، مگر کئی روز کے بعد اس میں دکھن پیدا ہو گئی۔ یہ حال دیکھ کر ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب مظفر نگری مقیم خدمت مولانا کو تردد ہوا اور اس کی تدبیر شروع کی، رفتہ رفتہ دکھن بڑھتی گئی اور کچھ ورم بھی ظاہر ہوا، حتیٰ کہ جس شب میں حضرت کو بخار آیا بعد مغرب گھر تشریف لے جانے میں بھی زیادہ تکلیف ہوئی اور نمازِ عشاء بھی بتکلّف پڑھائی۔

۱۷ جمادی الاوّل ۱۳۲۳ھ یوم دو شنبہ مطابق ۳۱ جولائی ۱۹۰۵ء کو نماز عشاء پڑھا کر حسب معمول چارپائی پر لیٹے۔ خدام بدن دبانے لگے، تھوڑی دیر میں سردی معلوم ہوئی اور اس شدّت سے جاڑا آیا کہ دس بجے سے بارہ بجے تک برابر رہا، بعدہٗ بخار زور سے ہو گیا، سہ شنبہ کا تمام دن شدّت بخار اور کرب میں گزرا۔ اوّل روز معمولی دوا دی گئی۔ لیکن چہار شنبہ کو بھی جب بخار کی وہی شدّت رہی تو جناب صاحبزادہ والا شان مولانا حکیم مسعود احمد صاحب نے نہایت مستعدی کے ساتھ بکمال حذاقت و استقلال خداداد تدبیر شروع کی، کبھی کبھی کچھ تخفیف معلوم ہوتی تھی، مگر بخار بالکل کسی وقت بھی زائل نہیں ہوا۔

حضرت مولانا کو ہمیشہ موسمی بخار آتا تھا لیکن یہ بخار بالکل نئی طرح کا تھا کہ ابتداء ہی سے ایک قسم کی غفلت اور بیخودی شروع ہو گئی۔ بدن ایسا بے قابو ہو گیا کہ کئی کئی آدمی پکڑ کر اٹھاتے تھے۔ بار بار یہ فرماتے تھے کہ اس دفعہ میں میرے بدن کو کیا ہو گیا۔ پیر کا ورم اس قدر بڑھ گیا کہ خود اس کو حرکت نہ دے سکتے تھے، رفتہ رفتہ زانو تک پہونچ گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب اور ڈاکٹر اللہ بندہ صاحب نے چاہا کہ شگاف دیا جاوے لیکن دیکھ بھال کر رائے بدل گئی، اکثر لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ پیر کی یہ حالت اور بخار کی یہ کیفیت کسی سمی چیز کا اثر ہے، غالب خیال یہ ہو گیا کہ شاید حجرہ کے اندر کسی سانپ نے کاٹا ہے، اس خیال کے ساتھ ہی اس فن کے جاننے والے بلائے گئے۔ اگرچہ انھوں نے کچھ دوا کا استعمال کیا لیکن پیر کی حالت ایسی ہو گئی کہ اس کو دیکھ کر اس بارے میں پوری رائے نہیں قائم کر سکے۔

پنج شنبہ ۳ اگست بمطابق ۱۹۰۵ء کو جناب مولوی حکیم محمد اسماعیل صاحب گنگوہی مقیم بمبئی، خادم و مخلص دیرینہ و موردِ الطاف خاص حضرت مولانا قدس سرہٗ بمبئی سے تشریف لاتے، چونکہ حکیم صاحب موصوف طبیب حاذق ہونے کے ساتھ حضرت مولانا کے مزاج مبارک سے پورے واقف تھے اس لیے خود انھوں نے یوم جمعہ ۴ اگست سے معالجہ اور تدبیر اپنے ہاتھ میں لی اور نہایت تندہی اور جانثاری سے مشغول ہو گئے۔ جناب صاحبزادہ صاحب نے بھی چار روز تک حالت مرض کو دیکھ بھال کر یہی مناسب خیال فرمایا۔ حکیم صاحب اور حکیم صاحب کے برادرِ خورد حکیم محمد یوسف صاحب دن رات مصروف خدمت رہے۔ راتوں کو جاگتے تھے، کوئی تدبیر جو ان کے امکان میں تھی فروگذاشت نہیں کی لیکن حضرت مولانا سفرِ آخرت کا تہیہ فرما چکے تھے اور شوقِ رفیقِ اعلیٰ غالب آ چکا تھا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی۔ آٹھ روز ہچکیوں کی سخت تکلیف رہی، لیکن پنج شنبہ ۱۰ اگست کی شب اور دن کو بہت سے عوارض میں کچھ خفّت معلوم ہوئی، ہچکیاں قریباً بند ہو گئیں نبض میں بھی قوّت محسوس ہوتی تھی، مگر یہ تخفیف زیادہ دیر قائم نہ رہی، بارہ بجے کے بعد سے پھر کرب اور بے چینی بڑھ گئی۔ مولانا کے مرض کی اطلاع اوّل دو چار روز تو سوائے مخصوص لوگوں کے قرب و جوار میں بھی کسی کو نہ ہوئی، لیکن جب یہ خبر شائع ہوئی تو جہاں جس جگہ تک یہ اطلاع پہونچی لوگ اس کثرت سے جوق در جوق آتے تھے کہ خانقاہ میں باوجود وسعت کے جگہ نہ ملتی تھی اور اگرچہ اکثر لوگ زیارت کر کے واپس چلے جاتے تھے مگر پھر بھی ہجوم دن بدن بڑھتا گیا، ۔۔۔۔ مشتاقانِ زیارت کا یہ ہجوم کہ ہر وقت کھڑے رہتے مولانا کی تیمارداری خاص اسی جگہ ہوئی جس جگہ ہمیشہ تشریف رکھتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں پردہ اٹھا کر زیارت کرا دی جاتی تھی اور

لوگوں کو رخصت کر دیا جاتا تھا۔ مگر مجمع کسی وقت کم نہ ہوتا تھا چونکہ یہ مجمع اکثر علماء و صلحاء کا تھا اس لیے روزانہ متعدد ختم کلام مجید، بخاری شریف اور آیۂ کریمہ و سورۂ فاتحہ وغیرہ کے ہوتے تھے، اور مجمع کثیر کے ساتھ نہایت تفرع و زاری کے ساتھ دعائیں مانگی جاتی تھیں اور یہ ختم اور دعا گریہ وزاری، آہ و بکا کے جلسے بھی ایسے پُراثر اور شاندار تھے کہ ہر دیکھنے والے پر اثر پڑتا تھا اور اب امید نہیں کہ عمر بھر بھی ان آنکھوں سے ایسے مجمعے صلحاء کے نظر پڑیں، مگر عین دعاء کے وقت بعض لوگوں کو یہ بات دکھلائی گئی کہ وقتِ رحلت قریب آ گیا، اور بعض خواص اہلِ کشف کو یہ بات منکشف ہوئی کہ اگرچہ مخلوق کی التجا یہ ہے مگر حضرت مولانا کی رغبت اس عالم کی طرف ہے۔

حضرت مولانا کو ۲ روز پہلے ہی جمعہ کے دن کا انتظار تھا، چنانچہ شنبہ کے روز فرمایا کہ آج جمعہ ہے۔ خدام نے عرض کیا کہ نہیں آج شنبہ کا دن ہے، پھر درمیان میں بار بار دریافت فرمایا۔ یک شنبہ کو مولوی حبیب احمد صاحب سے جو حضرت مولانا کے جانثار خدام میں سے ہیں اور خاص خدمت تیمارداری قدیم سے انہیں کے متعلق ہے یہ فرمایا کہ پانچ روز اور خدمت کرنی ہے اور عین اس جمعہ کی صبح کو بھی دریافت فرمایا کہ کیا دن ہے، جب معلوم ہوا کہ یوم جمعہ ہے تو فرمایا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

ابتداء مرض ہی سے ایک قسم کی بےخودی شروع ہو گئی تھی جس کو عام لوگ غفلت سے تعبیر کرتے تھے، ابتداء میں یہ حالت کم تھی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی مگر یہ حالت یقیناً مشغول اور استغراق کی تھی، غفلت ہرگز نہ تھی، جو بات عرض کی جاتی تھی اس کو خوب سمجھتے تھے۔ اکثر گھبراہٹ میں ہٹلانے کا اشارہ فرماتے تھے۔ بیٹھنے کی بھی وہ ہی شان اور ہیئت ہوتی تھی جو بزمانۂ صحت حالت مراقبہ میں ہوتی تھی، جو اوقات اورادِ معینہ کے تھے ان میں خود بخود اسطرف متوجہ ہو جاتے، مثلاً بعد نماز جمعہ سورۂ کہف پڑھنے کا معمول تھا۔ ۴۔ اگست کو جو جمعہ واقع ہوا، اس میں حسبِ معمول سورۂ کہف شروع کر دی، خصوصاً آخر شب میں زیادہ متوجہ ہوتے تھے۔

شب کو اکثر وقت آیاتِ کلام الٰہی اور دعائیں زبان سے نکلتی تھیں جو کبھی پوری سمجھ میں آتی تھیں کبھی نہیں، بعض دفعہ ذکر نفی و اثبات جہراً اور صوت کے ساتھ شروع فرما دیتے تھے، بعض وقت نہایت عالی کلمات معرفتِ الٰہی زبان سے نکلتے تھے۔ طہارت اور پاکیزگی کا اس قدر خیال تھا کہ ایک دفعہ اسی حالت بےخودی میں یہ شبہ ہو گیا کہ دونوں انگلیوں کو کچھ لگ گیا ہے۔ اسی وقت سے ان دونوں کو باقی انگلیوں سے علیحدہ کر لیا۔ عرصہ دراز تک اسی طرح رکھا جس سے طبیبوں کو شبہ ہو گیا کہ شاید تشنج ہو گیا، مگر بعض مزاج داں خدام نے سمجھ کر ان کو خوب دھو کر اطلاع دی کہ حضرت انگلیاں پاک کر دی گئیں۔ اس وقت ان کو باقی انگلیوں کے ساتھ شامل کیا۔ یہ حالتِ صحت عادت شریفہ یہ تھی کہ صبح نماز کے بعد زمزم شریف پیا کرتے تھے۔ ایام مرض میں کئی دفعہ فرمایا کہ آج زمزم شریف نہیں پلایا۔

اس دفعہ مختلف تکالیف جمع ہونے سے اس قدر کرب بےچینی رہتی تھی کہ دیکھنے والے دیکھ نہ سکتے تھے مگر حضرتِ اقدس مولانا کی استقامت علی الشرع اور توجہ الی اللہ کی یہ کیفیت تھی کہ سخت سے سخت تکلیف کے وقت میں بھی ذرا کمی نہ آتی تھی، نشست و برخاست سے معذور ہو گئے تھے پیر کو حرکت تک نہ دے سکتے تھے مگر نمازیں وضو کے ساتھ کھڑے ہو کر پڑھتے تھے۔ وضو اسی طرح اسباغ کے ساتھ ہوتا جیسا حالتِ صحت میں۔ کھڑے ہونے کی طاقت نہ تھی، تین چار آدمی لے کر کھڑے ہوتے تھے۔ وہی رکوع سجدہ کراتے تھے اس نشست و برخاست میں لب اوقات دُکھتے پیر میں چوٹ لگ جاتی تھی مگر فراغ نماز تک ہرگز اف نہ کرتے تھے، بعض بعض دفعہ ایک نماز کے لیے دو دفعہ وضو کرنے کی نوبت آتی، مگر ہرگز

نہیں گھبراتے، لوگ یہ حال و تکلیف
دیکھ کر پریشان ہوتے، بڑے
بڑے علماء کا مجمع تھا۔ سب
نے عرض کیا کہ حضرت ایسی
حالت میں تو بیٹھ کر نماز پڑھنے
کی تو اجازت ہے، مکرّر عرض
کرنے پر ارشاد فرمایا کہ کتاب تو
دیکھو! کتاب دیکھی گئی، یہ مسئلہ
لکھا تھا کہ اگر کسی کے خادم ایسے
ہوں جو کھڑے کروا کر نماز پڑھوا
دیں تو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا
چاہیے، سبحان اللہ! اس حالت
میں ربوبیت تک کا خیال نہ چھوٹا،
جب کھڑے کرکے نماز پڑھوانا بھی
بالکل دشوار ہو گیا تب بہت اصرار
کے بعد بیٹھ کر نماز پڑھنے پر رضامند
ہوتے، مگر حالت استغراق اور
بے خودی کی اس قدر بڑھتی جاتی
ہے کہ رکوع و سجود کی تعداد میں
نسیان ہوتا تھا، خدام تبلاتے جاتے
تھے، اس طرح بمشکل نماز کو ختم کیا
جاتا تھا۔

اس تمام مدّتِ مرض میں زبان
مبارک ذکر کے ساتھ برابر جاری
رہتی تھی، مگر اسی حالت میں
جس کو نیند سے تعبیر کیا جاتا تھا
البتہ زبان بند ہوتی تھی، اکثر اوقات
دونوں ہاتھوں کی کشش اس طرح
جاری رہتی تھی جس طرح حالتِ
صحت میں تسبیح ہاتھوں میں لے
کر پڑھتے تھے۔ اسی حالت میں
شمار کے دانہ کھینچنے کی حرکت علیحدہ
ہوتی تھی، الغرض تمام مدتِ مرض
میں قلب، دماغ، لسان اور باقی
جوارح تمام اسی طرف متوجہ تھے۔
کسی اور طرف اصلاً توجہ نہ تھی۔

ان ایام میں بجز اس کے کہ
بعض دفعہ کسی خادم کو کچھ ارشاد
فرمایا یا کسی کو یاد فرمایا، مثلاً
ایک دفعہ حاجی عبدالمجید صاحب
گنگوہی قدیمی جانثار سے ارشاد ہوا
کہ بھائی عبدالمجید ثواب بھی پہنچاؤ
گے؟ یا ایک دفعہ حضرت صاحبزادہ
صاحب والا شان کو ارشاد ہوا کہ
بھائی مسعود احمد وضو کرا دو، یا اپنے
نہایت عزیز پوتے میاں سعید احمد
کو ایک دو دفعہ بلا کر پاس
بٹھلایا، یا یہ کہ شبِ جمعہ کو جو
آخری شب تھی مولوی محمد یحییٰ
صاحب کاتب خطوط جانثار خاص
کا نام لے کر کچھ اشارہ کیا جس
کو وہ پوری طرح نہیں سمجھے مگر
انھوں نے حضرت کے دونوں ہاتھ
اپنے سر پر رکھ لیے، زبان سے
کچھ فرمایا جو سمجھ میں نہیں آیا۔
اسی قسم کی اور چند باتوں کے سوا
کسی سے کوئی خاص بات ارشاد نہیں
فرمائی۔ یہ تمام وہ حالات تھے جن
کو عام و خاص سب مشاہدہ کرتے
تھے اور حق تعالیٰ کی قدرت کا تماشا
دیکھتے تھے۔ سبحان اللہ "المحیا محیاہم
والممات مماتہم"۔

پنجشنبہ کے دن بارہ بجے سے
تکلیف زیادہ ہو گئی اور تمام شب
اسی طرح گزری اور جمعہ کا دن جو
حشر برپا کرنے والا تھا آ پہنچا، کوئی
خاص تغیّر جمعہ کے دن بھی ایسا نہ
تھا جس سے اتنی عجلت کا خیال ہوتا
بلکہ اطباء کا بھی یہ خیال تھا کہ قطعاً
مایوسی کی کوئی علامت نہیں، مگر
اکثر حضرات یہ فرماتے تھے کہ آج
جمعہ کا روز ہے، اگر آج کا دن
خیریت سے گذر گیا تو انشاء اللہ خیریت
ہے، بارہ بجے تک کوئی نئی بات
پیدا نہیں ہوئی، زوال کے ہوتے
ہی دفعۃً حالت بدل گئی اور زیادہ
سے زیادہ پانچ منٹ میں ذکرِ الٰہی کے
ساتھ آخری سانس ختم ہو گیا۔

جمعہ کے روز سوا بارہ بجے ۸ جمادی
الثانیہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء
یہ حادثہ نمونۂ قیامت پیش آیا، حضرت
مولانا کی عمر مبارک ۷۸ سال، ۷ ماہ ۴
روز کی تھی اور وہ نمونۂ قیامت حادثہ
جس کے خیال سے بھی بدن میں رعشہ
پیدا ہو جاتا تھا آنکھوں کے سامنے
آ گیا، مولانا کے بڑے بڑے خلفاء
جانثار خادم، اور وہ پروانہ وار عاشق
جن کو ایک گھڑی بھی بلا جمالِ مبارک
چین نہ آتا تھا گرد و گرد کھڑے تھے
اور دیکھ رہے تھے کہ حضرت مولانا
سب کو اس بے کسی اور بے بسی
کی حالت میں چھوڑ کر تشریف لے
جا رہے ہیں۔ آہ کیسا سخت وقت
تھا کہ جس چہرۂ مبارک کی زیارت کو
اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد سمجھ رہے
تھے وہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے
غائب ہو رہا تھا۔ انا للہ و انا الیہ
راجعون۔ اللہ اللہ باوجود اس شورش
اور خود رفتگی، تحیّر و پریشانی اس مجمع
خدّام و عشاق کا صبر و استقلال نہایت
تحیّر انگیز امر تھا، جو لوگ حالتِ
حیات میں بھی جذبات عشق و محبت

کو ضبط نہ کر سکتے تھے وہ اسوقت کس استقلال و صبر کے ساتھ کھڑے تھے اور کس طرح اس جانکاہ صدمہ کو برداشت کر رہے تھے، اس میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ حضرت مولانا کے لیے کرامت تھی کہ سب مجمع مبتلاء غم اور خاموش اور بلاشبہ یہ آپ کی پاک اور اعلیٰ تعلیم کا اثر تھا کہ کسی سے کوئی امر خلافِ سنّت صادر نہیں ہوا، گریہ طاری ہوتا تھا مگر اسی حد تک جو خلاف شرع نہیں۔ اور اکثر بڑے بڑے لوگوں پر تو تحیّر غالب تھا، سب کے سب "رضینا برضاء اللہ" پر کاربند رہے اور احکام الٰہی کی پابندی میں سنّت کے موافق تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئے۔ جمعہ کے روز سوا بارہ بجے ۸ جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء میں یہ حادثہ پیش آیا۔

مجمع نے اوّل نماز جمعہ ادا کی، بعدہٗ اسی سہ دری میں جس جگہ حضرت مولانا کی چارپائی بچھتی تھی غسل دیا گیا۔ خاص خاص خلفاء مثل مولانا محمود حسن صاحب و مولانا خلیل احمد صاحب و مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری وغیرہ نے غسل دیا اور ارادہ یہ تھا کہ عین خانقاہ کے صحن میں تمام مخلوق کو عام زیارت جمال مبارک کی کرائی جائے، مگر اس کثرت سے ہجوم تھا اور لوگ اسطرح ایک دوسرے پر گر رہے تھے کہ کسی طرح نہ معلوم ہوا، مجبوراً جنازہ اٹھا لیا اور جنگل میں متعدد دفعہ عام زیارت کرائی گئی۔

تجہیز و تکفین سے پہلے حضرت مولانا کے خاص قلم مبارک لکھا ہوا وصیت نامہ جو صحت و بصارت کے زمانہ کا لکھا ہوا تھا نکال کر مجمع میں پڑھا گیا۔ اس وصیت نامہ میں تمام ضروری امور درج ہیں۔ یہ وصیت نامہ جس کے اندر اتباعِ سنّت اور پابندئ شرع کی تاکید نہایت پراثر الفاظ میں فرمائی ہے زیارت کے قابل ہے۔

گنگوہ کے تمام اہل اسلام اور باہر کے اس مجمع کثیر کا ہجوم اس قدر تھا کہ بہت ہی مشکل سے جنازہ تک کوئی پہونچ سکتا تھا، مجمع کی تعداد کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا کسی نے شمار نہیں کیا مگر اقل درجہ پانچ چھ ہزار سے کم نہ ہوگا۔

اول نماز جنازہ پڑھی گئی، بعدہٗ نماز عصر ادا ہوئی، قبر مبارک کی تیاری میں کسی قدر دیر تھی، بعد نماز مغرب خزانہ معرفت الٰہی و مخزن شریعت و طریقت کو اپنے ہاتھوں سپرد زمین کرکے بادلِ گریاں واپس آئے۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت مولانا کی انگلی میں سانپ نے کاٹا تھا۔ ہم اس کے متعلق تیقّن کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ آنکھ سے کسی نے نہیں دیکھا۔ مگر واقعہ جو گزرا ہے وہ مفصل عرض کر دیا گیا، یہ امر مسلّم ہے کہ بخار میں سمی اثر ضرور تھا مگر بلا دیکھے یقینی حکم لگانا مشکل ہے، اگر یہ امر صحیح ہے کہ سانپ نے کاٹا اور بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے تو یہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہٗ کے ساتھ کمال مطابقت تھی کہ اس عنوان سے درجہ شہادت ملا۔

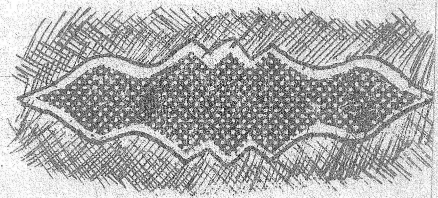
جو شان محبوبیّت کی حق تعالےٰ نے حضرت مولانا کو عطا فرمائی تھی جنازہ پر بھی اضعاف مضاعف زیادہ وہی شان برستی تھی۔ جن لوگوں نے چہرۂ مبارک کی زیارت اطمینان کے ساتھ اس جگہ کی کی، جہاں ممبر شریف کے متصل تمام مخلوق کو زیارت کرائی گئی ہے اس کی عظمت و شان وہی جانتے ہیں۔ اس وقت عام لوگوں کا خود بخود ذکر میں مشغول ہونا بھی عجب پرہیبت سماں تھا۔

اور اسی طرح حضرت مولانا کی حالت وفات کو بہت سی باتوں میں حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت وفات سے صورۃً و معنیً مشابہت حاصل ہوئی، مثلاً حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی آخر میں اس سم کا اثر ظاہر ہوا جو خیبر میں دیا گیا، یا مثلاً حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس ہیئت سے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا آپ کو لیے ہوئے بیٹھی تھیں اور اسی حالت میں آپ نے وفات پائی، اسی طرح حضرت مولانا نے بھی بٹھلانے کا اشارہ کیا اور منشی منظور احمد صاحب رامپوری آپ کو لے کر بیٹھے پہلے سے کوئی علامت اس قسم کی نہ تھی مگر بٹھلانے کے بعد ہی حالت بدل گئی۔ جلدی کر کے لٹایا اور فوراً روح قبض ہو گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی باتیں ہیں جو کسی دوسرے موقع پر لکھی جاویں گی۔

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی وفات

سے قبل اور عین وفات کے وقت اور بعد وقت بہت سے واقعات لوگوں کو دکھلائے گئے۔ جن کے لکھنے میں طول ہے، مگر ایک بات کا عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ عین قبض روح کے وقت ایک خادم نے جو نہایت ذاکر، شاغل صاحب حال تھے، اسی وقت کھڑے ہوئے اور یہ دیکھا کہ مولانا کی روح مبارک برق کی طرح گئی اور حضرۃ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو اپنی گود میں اس طرح لیا جس طرح ماں اپنے بچہ کو لیتی ہے، اس قسم کے واقعات کا مشاہدہ کچھ مستبعد نہیں، اہل اللہ پر حق تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے، ان کو باطنی کمالات کے ساتھ ظاہری قضیا بھی دی جاتی ہیں۔ اور ان کا اظہار بھی کسی کسی پر کر دیا جاتا ہے۔

مضمون طویل ہو گیا۔ اب میں اس کو ختم کرتا ہوں، زیادہ تفصیلی حالات دیکھنے کے واسطے لوگوں کو حضرت مولانا کی سوانح عمری کا انتظار کرنا چاہیئے۔



اسلام کا نظام تعلیم اور اس کے انقلابی اثرات

محمد تقی عثمانی

نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تیئس سال کی مختصر سی مدّت میں جو حیرت انگیز انقلاب برپا کیا اس کی برق رفتاری اور اس کے ہمہ گیر اثرات نے ان لوگوں کو بھی انگشت بدنداں کر دیا جو آنحضرۃ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے مشن کے سخت مخالف رہے ہیں۔ یہ آپ کی تعلیم و تربیت کا حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ تیئس سال کی مختصر مدّت میں صحرائے عرب کے جو وحشی علم و معرفت اور تہذیب و تمدن سے بالکل کورے تھے وہ پوری دنیا میں علم و حکمت اور تہذیب و شائستگی کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ جو لوگ کل تک ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے وہ آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں، جہاں ہر طرف قتل و غارت گری کی آگ بھڑک رہی تھی وہاں آشتی کے گلاب کھل اٹھتے ہیں؛ جہاں ظلم و بربریّت کا دور دورہ تھا وہاں عدل و انصاف کی شمعیں روشن ہو جاتی ہیں، جہاں پتھر کے بتوں کو سجدے کیے جا رہے تھے، وہاں توحید کا پرچم لہرانے لگتا ہے، اور بالآخر عرب کے یہی صحرا نشین جو اپنی جہالت کی وجہ سے دنیا بھر میں ذلیل و خوار تھے، ایران و روم کی عظیم سلطنتوں کے وارث بن جاتے ہیں اور ساری دنیا ان کے عدل و انصاف، ان کی رحم دلی، اور ان کی شرافتِ نفس کے گن گانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس طرح نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم و تربیت کا جو سو فیصد نتیجہ دنیا نے دیکھا ہے۔ تاریخ انسانیت کے کسی اور معلّم کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آج کی اس مختصر نشست میں ہم اسی بات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم و تربیّت کی وہ کیا بنیادی خصوصیات تھیں جنھوں نے دنیا بھر میں یہ حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔

موضوع تو بڑا طویل اور تفصیل کا

محتاج ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے انداز تعلیم و تربیّت کی تمام خصوصیات کا احاطہ کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے، لیکن میں یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے انداز تربیّت کی صرف دو خصوصیّات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اپنی محدود بصیرت اور مطالعے کی حد تک مجھے سب سے زیادہ بنیادی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے پہلی خصوصیّت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شفقت و رحمت، دلسوزی و خیرخواہی اور رحم دلی و رحم خوئی ہے۔

جس شخص نے بھی سیرتِ طیبہ کا کچھ مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مخالفین نے آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے آپ کو طرح طرح سے اذیت پہونچائی اور آپ پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن آپ کی پوری سیرت اس بات کی گواہ ہے کہ آپ کے دل میں کبھی ایک لمحے کے لیے انتقام کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، آپ ان پر غضبناک ہونے کے بجائے ان پر ترس کھاتے تھے کہ یہ لوگ کیسی سنگین گمراہی میں مبتلا ہیں، اور ہروقت آپ کو یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ وہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے حق بات ان کے دل میں اتر جائے اور یہ ہدایت کے راستے پر آجائیں۔

آپ اس قسم کے معلّم نہ تھے کہ محض کوئی کتاب پڑھا کر یا درس دے کر فارغ ہو بیٹھتے ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ اس کے بجائے آپ اپنے زیرِ تربیّت افراد کی زندگی کے ایک ایک شعبے میں دخیل تھے، آپ ان کے ہر دکھ درد میں شریک اور ہر لمحے ان کی فلاح و بہبود کے لیے فکرمند رہتے تھے۔

علامہ نورالدین ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں مسندِ احمد اور معجم طبرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان سرکارِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آ کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھے زنا کی اجازت دے دیجیے" ــــ ذرا تصوّر تو کیجیے کہ کیا فرمائش کی جا رہی ہے؟ ایک ایسے گھناؤنے گناہ کو حلال قرار دینے کی فرمائش جس کی قباحت و شناعت پر دنیا بھر کے مذاہب و ادیان متفق ہیں، اور یہ فرمائش کس سے کی جا رہی ہے؟ اس برگزیدہ ہستی سے جس کی عصمت و عفّت سے آگے فرشتوں کا بھی سر جھک جاتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو تو اس نوجوان کو مارپیٹ کر یا کم از کم ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکلوا دیتا۔ لیکن یہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم تھے جن کا کام برائی پر خفگی کا اظہار کر کے پورا ہو جاتا تھا، بلکہ جو اس برائی کے علاج کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے تھے، آپ کے دل میں اس نوجوان کے خلاف بغض و غضب کے بجائے ہمدردی و رحم کے جذبات پیدا ہوتے آپ نے اس پر ناراض ہونے کے بجائے اسے پیار کے ساتھ اپنے پاس بلایا، اپنے قریب بٹھایا، اس کے کندھے پر مشفقانہ ہاتھ رکھا، اور محبّت بھرے لہجے میں فرمایا: "اچھا یہ بتاؤ کہ جو عمل تم کسی اجنبی خاتون کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، اگر کوئی دوسرا شخص تمہاری ماں کے ساتھ کرنا چاہے تو کیا تم اس کو گوارہ کرلوگے؟" نوجوان کے ذہن و فکر کے بند دریچے ایک کر کے کھلنے لگے، اس نے کہا نہیں یا رسول اللہ!، آپ نے فرمایا: "تو پھر دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں کے لیے یہ بات پسند نہیں کرتے"۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص تمہاری بہن کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو کیا تم اس کو گوارا کرلوگے؟ نوجوان نے عرض کیا: "نہیں یا رسول اللہ"۔ آپ نے فرمایا کہ جو بات تمہیں اپنی بہن کے لیے گوارا نہیں، دوسرے لوگ بھی اپنی بہنوں کے ساتھ اسے پسند نہیں کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اس نوجوان کو مثالیں دے کر سمجھاتے رہے اور آخر میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا بھی فرمائی کہ "اللّٰھم اغفر ذنبہ وطھّر قلبہ وحصّن فرجہ" یا اللہ! اس کے گناہ کو معاف فرما دیجیے اور اس کے قلب کو پاک کر دیجیے اور اس کی شرمگاہ کو عفّت عطا فرمایئے"۔ یہاں تک کہ جب وہ مجلس سے اٹھا تو اس گھناؤنے عمل سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو چکا تھا۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نوجوان پر غیظ و غضب کا اظہار کر کے

اپنے مشتعل جذبات کی تسکین کر سکتے تھے، لیکن اس صورت میں آپ کو اس نوجوان کی زندگی تباہ ہوتی نظر آ رہی تھی، یہ آپؐ کی نرم خوئی، حکمت اور تدبر و تحمّل ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ نوجوان ہلاکت کے گڑھے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ کاش کہ آج کے مصلحین، اساتذہ اور واعظین سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سُنّت پر عمل پیرا ہو سکیں تو آج اُنھیں اپنے نوجوانوں کی بے راہ روی کی شکایت نہ رہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اندازِ تعلیم و تربیّت کی دوسری اہم خصوصیّت جسے میں اہمیّت کے ساتھ اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں، اور جو میری نظر میں آپ کے اندازِ تربیّت کی سب سے زیادہ مؤثر خصوصیّت ہے، اور وہ یہ کہ آپ نے اپنے پیروؤں کو جس جس بات کی تعلیم دی، اس کا بذاتِ خود عملی نمونہ بن کر دکھایا۔ آپؐ کے وعظ و نصائح اور آپ کی تعلیم و تربیّت صرف دُوسروں کے لیے نہ تھی۔ بلکہ سب سے پہلے اپنی ذات کے لیے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سے معاملات میں آپؐ کو رخصت و سہولت عطا فرمائی، لیکن آپ نے اس رخصت و سہولت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے آپ کو دوسرے تمام مسلمانوں کی صف میں رکھنا پسند فرمایا۔

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے لوگوں کو نماز کی تلقین فرمائی، تو خود اپنا عالم یہ تھا کہ دوسرے اگر پانچ وقت نماز پڑھتے تھے، تو آپؐ آٹھ وقت نماز ادا فرماتے تھے۔ جس میں چاشت، اشراق اور تہجد کی نمازیں شامل ہیں۔ تہجّد عام مسلمانوں کے لیے واجب نہ تھا، لیکن آپؐ پر واجب تھا۔ اور تہجد بھی ایسی کہ کھڑے کھڑے پاؤں پر ورم آ جاتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ: "یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ آپؐ کی تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف نہیں فرما دیں۔ پھر آپؐ کو اتنی محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔؟" آپؐ نے فرمایا کہ "بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ کرم فرمایا ہے، لیکن کیا میں اللہ کا شکرگزار بندہ نہ بنوں؟"[1]

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دُوسروں کو نماز باجماعت کی تعلیم دی تو خود یہ عمل کر کے دکھایا کہ ساری زندگی نماز باجماعت کی جو پابندی فرمائی وہ تو اپنی جگہ ہے، عین مرضِ وفات میں بھی آپؐ نے مسجد کی جماعت کو نہیں چھوڑا، بلکہ دو آدمیوں کے کندھے کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لاتے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا تو خود آپؐ کا عمل یہ تھا کہ عام مسلمان اگر رمضان کے فرض روزے رکھتے تھے تو آپؐ کا کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہ تھا۔ عام مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ صبح کو روزہ رکھ کر شام کو افطار کر لیا کریں۔ لیکن خود آپؐ کئی کئی روز مسلسل اس طرح روزے رکھتے تھے کہ رات کے وقت میں بھی کوئی غذا آپؐ کے مُنہ میں نہیں جاتی تھی۔

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کو زکوٰۃ دینے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تاکید فرمائی تو سب سے پہلے خود اپنی زندگی میں اس کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔ عام مسلمانوں کو اپنے مال کا چالیسواں حصّہ فریضے کے طور پر دینے کا حکم تھا، اور اس سے زیادہ حسبِ توفیق خرچ کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ لیکن خود آنحضرۃ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا عمل یہ تھا کہ اپنی فوری ضرورت کو سادہ طریقے سے پورا کرنے کے بعد اپنی ساری آمدنی ضرورتمند افراد میں تقسیم فرما دیتے تھے، آپؐ کو یہ تک گوارا نہ تھا کہ آپؐ کی وقتی ضرورت سے زائد ایک دینار بھی گھر میں باقی رہے۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز کے بعد خلافِ معمول فوراً گھر میں تشریف لے گئے، اور جلد ہی باہر واپس آ گئے، صحابہ کرامؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: "مجھے نماز میں یاد آیا کہ سونے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، مجھے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ رات آ جائے اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے گھر میں پڑا رہ جائے۔"

---

[1] مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۲۹ طبع بیروت۔ کتاب العلم باب فی آدب العالم۔

حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ رنجیدہ گھر میں تشریف لائے، میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا: "ام سلمہؓ! کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہوگئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے۔" حد یہ ہے کہ مرضِ وفات کی حالت میں جب کہ بیماری کی تکلیف نے سخت بے چین کیا ہوا آپؐ کو یاد آتا ہے کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں، فوراً حکم دیتے ہیں کہ "انھیں خیرات کر دو، کیا محمدؐ اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔" عام مسلمانوں کے لیے آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ جوش میں آکر اپنی ساری پونجی خیرات کردینا مناسب نہیں، بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق مال اپنے پاس رکھ کر باقی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، لیکن مسلمانوں کو اس تعلیم کا عادی بنانے کے لیے خود آپؐ نے اپنے عمل کا یہ نمونہ پیش فرمایا کہ گھر میں کوئی نقدی نہ چھوڑی، تاکہ لوگ اس مثالی طرزِ عمل کو دیکھ کر کم از کم اس حد تک آ سکیں جو اسلام کو عام مسلمانوں سے مطلوب ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو زہد و قناعت کی تعلیم دی، تو خود اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کرکے دکھایا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب بعض صحابہؓ نے آپؐ سے بھوک کی شدت کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ اس پر پتھر بندھا ہوا ہے تو سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اپنا بطن مبارک کھول کر دکھایا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مساوات اور بھائی چارے کی تعلیم دی تو سب سے پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ کہ اگر دوسرے مسلمان عام سپاہی کی حیثیت میں مدینہ طیبہ کے دفاع میں خندق کھودنے کی مشقت برداشت کر رہے تھے تو ان کا آقا اور امیر (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف قیادت ونگرانی کا فریضہ انجام نہیں دے رہا تھا، بلکہ بہ نفس نفیس کدال ہاتھ میں لے کر خندق کھودنے میں شریک تھا اور زمین کا جتنا ٹکڑا ایک عام سپاہی کو کھودنے کے لیے دیا گیا تھا، اتنا ہی ٹکڑا اس نے اپنے ذمے لیا تھا۔

ایثار کی تعلیم ہر معلمِ اخلاق نے دی ہے، لیکن عموماً یہ تعلیم معلم کے الفاظ اور فلسفے سے آگے نہیں بڑھتی، اس کے برخلاف انسانیت کے اس معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ایثار کے الفاظ کم استعمال کیے اور عمل سے اس کی تعلیم زیادہ دی۔ حضرت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی چہیتی صاحبزادی ہیں، اور مرتبے کے لحاظ سے صرف عرب کی نہیں دونوں جہان کی قابلِ احترام شہزادی ہیں، لیکن چکی پیستے پیستے ان کی ہتھیلیاں گھس گئی ہیں وہ آکر درخواست کرتی ہیں کہ مجھے کوئی خادمہ دلوا دی جائے۔ لیکن باپ کی زبان سے یہ ملتا ہے کہ فاطمہؓ ابھی صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا، اس لیے تمہاری خواہش پر عمل ممکن نہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صبر وتحمل اور عفو و درگزر کا سبق دیا تو خود اس پر عمل پیرا ہوکر دکھلایا۔ ایک مرتبہ کسی شخص کا کچھ قرضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھا، اس شخص نے آپ قرض کا مطالبہ کیا، اور اس غرض کے لیے کچھ گستاخانہ الفاظ استعمال کیے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حقوق العباد کی ادائیگی کا کس قدر اہتمام تھا، اور آپ اس شخص کے تقاضے کے بغیر ہی اس کا قرض ضرور چکاتے اس لیے اس شخص کے پاس اس تلخ کلامی کا کوئی جواز نہ تھا، چنانچہ جب آپ کے جانثار صحابہؓ نے اس شخص کا یہ گستاخانہ انداز دیکھا تو اسے اس گستاخی کا مزہ چکھانا چاہا، لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اس کے تمام تر اشتعال انگیز اور تکلیف دہ رویے کو دیکھنے کے باوجود صحابہؓ سے فرماتے ہیں کہ:

دعوہ فان لصاحب الحق مقالاً

"اسے رہنے دو، وہ صاحبِ حق ہے اور صاحبِ حق کو بات کہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔"

اور عفو و درگزر کا جو معاملہ آپؐ نے فتحِ مکہ کے موقع پر فرمایا، وہ تو ساری دنیا کو معلوم ہے کہ جن لوگوں نے آپؐ اور آپ کے ساتھیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لیے ظلم وستم جو طریقہ نہیں چھوڑا تھا، انہی

لوگوں پر فتح پالینے کے بعد آپ نے یہ اعلانِ عام فرما دیا کہ:

"لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء - آج کے دن تم پر کچھ ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

خلاصہ یہ کہ آپ کی وہ تعلیم و تربیت جس نے دشمنوں تک کے دل جیتے اور جس نے ایک وحشی قوم کو تہذیب و شائستگی کے بام عروج تک پہونچایا، اس کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تعلیم محض ایک فکر اور فلسفہ نہیں تھی جسے خوبصورت الفاظ کا خول چڑھا کر آپ نے اپنے پیروں کے سامنے پیش کر دیا، بلکہ وہ ایک متواتر اور پیہم عمل سے عبارت تھی - آپ کی مبارک زندگی کی ہر ہر ادا مجسم تعلیم تھی - چنانچہ اگر احادیث نبوی کا استقراء کر کے دیکھا جائے تو اس میں قولی احادیث کی تعداد کم ہے، اور عملی احادیث کی تعداد زیادہ ہے - علامہ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "کنز العمال" اب تک احادیث نبویؐ کا سب سے جامع ذخیرہ سمجھی جاتی ہے - اس کتاب میں علامہ موصوف نے ہر عنوان کے تحت قولی اور فعلی احادیث کو الگ الگ ذکر کیا ہے - اگر اس کتاب ہی کا جائزہ لے لیا جائے تو بیشتر عنوانات کے تحت قولی احادیث کا حصہ مختصر اور فعلی احادیث کا حصہ زیادہ طویل نظر آتا ہے - جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی تعلیمات نے روئے زمین پر جو حسین و دلکش انقلاب برپا فرمایا، اس میں زبانی تعلیم کا حصہ کم اور عملی تعلیم کا حصہ زیادہ ہے۔

آج اگر ہم میں اساتذہ کی تعلیم واعظوں کے وعظ اور خطیبوں کی تقریریں نتائج کے اعتبار سے بے جان اور اصلاحِ معاشرہ کے عظیم کام کے لیے بے اثر نظر آتی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ آج ہمارے معلّموں، واعظوں اور خطیبوں کے پاس صرف دلکش الفاظ اور خوشنما فلسفے تو ضرور ہیں، لیکن ہماری عملی زندگی ان دلکش الفاظ اور خوشنما فلسفوں سے یکسر متضاد ہے - اور ایسی تعلیم و تربیت نہ صرف یہ کہ کوئی مفید اثر نہیں چھوڑتی، بلکہ بسا اوقات اس کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ طالب ایک شدید ذہنی کشمکش اور فکری انتشار کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے - استاذ کا بیان کیا ہوا زبانی فلسفہ اور مقرر کی شعلہ بیان تقریریں ایک محدود وقت کے لیے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ ضرور کر لیتی ہیں - لیکن جب تک اس کے ساتھ عملی نمونہ نہ ہو تو ان تقریروں سے صرف کان متاثر ہوتے ہیں اور بہت زیادہ ہوا تو عقل ان کی صحت کو تسلیم کر لیتی ہے، لیکن دلوں کو متاثر کرنے اور زندگیوں کی کایا پلٹنے کا عظیم کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک معلّم کی تعلیم اور واعظ کا وعظ خود اس کی اپنی زندگی میں عملی طور پر رچا بسا ہوا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے معلّموں اور واعظوں کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس راز کو سمجھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی صحیح معنیٰ میں پیروی کر سکیں - آمین۔

اسلام میں تصورِ ریاست

اسلام میں تصورِ ریاست پر ادھر تیس سال سے بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے جس سے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام شاید نام ہی ریاست یا سیاست کا ہے یہ ساری بحثیں اور تقریریں اس بات کی خبر دیتی ہیں، کہ ہم شعوری یا لاشعوری طور پر موجودہ وقت میں رائج فلسفہ ہائے سیاست سے خوش نہیں ہیں، اس لئے ہمیں ایسے فلسفۂ سیاست کی ضرورت ہے، جو ہماری اور انسانی سوسائٹی کی مشکلات کا مداوا بن سکے اور وہ ان برائیوں اور خامیوں سے پاک ہو، جو موجودہ فلسفہ ہائے سیاست سے ظہور میں آئی ہیں، یہ احساس بذاتِ خود قابلِ قدر احساس ہے واقعہ یہ ہے کہ موجودہ وقت میں ہمیں جس ذہنی قلق اور اضطراب سے واسطہ ہے، تقریباً اسی کا اظہار مغرب کے مفکرین نے بھی کیا ہے، مثلاً مسٹر رسل نے کہا ہے کہ ہمارے عہد کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ یہ ہے کہ فلسفہ، ادب اور سیاست کے میدان میں جنون کامیاب ہے، مزید یہ کہ جنون کی یہ کامیاب شکل تحریکات سے طاقت کی طرف بڑھ رہی ہے[1] رسل کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ موجودہ وقت میں انسان کو جنگ سے بچانے، اور اقتصادی ناہمواری سے محفوظ رکھنے کے لئے کسی عالم گیر اخلاقی نظام کے قائل ہیں، مگر یہ اخلاقی نظام بچھے اور بلّی کا اخلاقی نظام نہ ہو[2] رسل نے موجودہ اجتماعی صورتِ حال پر جس مایوسی کا اظہار کیا ہے، ڈاکٹر اقبال نے بہت پہلے اس بارے میں لکھا تھا۔ یقین جانیئے کہ یورپ موجودہ وقت میں انسان کی اخلاقی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے[3] غرضیکہ موجودہ فلسفہ ہائے سیاست سے اہل نظر مطمئن نہیں ہیں امید ہے کہ یہ قلق، یہ اضطراب کسی واضح، صحت مند اور قابلِ عمل سیاسی نظام کی تلاش پر منتج ہوگا، جہاں قلق و اضطراب کا اظہار ایک نیک فال ہے وہاں ان سیاسی بحثوں کو دیکھ کر مایوسی بھی ہوئی ہے کیونکہ تیس سالہ بحثوں نے ہمیں کوئی واضح سیاسی تصور نہیں دیا، حتیٰ کہ ہم ملک میں سیاسی استحکام پیدا کرنے میں یک قلم ناکام رہے، جس پر سب سے بڑی دلیل سنہ ۱۹۷۱ء کا سیاسی المیہ ہے، اس لئے آج اگر تصورِ ریاست کے ساتھ ساتھ ان بحثوں کا مختصر ناقدانہ جائزہ لیں تو یہ امر ہمارے لئے شاید زیادہ مفید ہوگا، اس لئے کہ بے نتیجہ بحث اسی طرح ہے جیسا کہ کتابی علم جو ہماری اجتماعی مشکلات کا حل نہ بتا سکے،

مولانا رومی نے لکھا ہے کہ ایک عالم جسے اپنے علم صرف و نحو پر بڑا غرور تھا، کشتی میں ملاح سے پوچھا کہ تم صرف و نحو جانتے ہو جی نہیں! ملاح نے جواب میں کہا، تم نے اپنی نصف عمر برباد کر ڈالی، عالم نے کہا، ملاح خاموش ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد کشتی بھنور میں آ گئی، تو اس نے عالم سے پوچھا کہ کیا آپ تیرنا جانتے ہیں؟ نہیں! عالم نے کہا تم نے اپنی ساری عمر برباد کر ڈالی، ملاح نے جواب میں کہا۔

رومی نے یہاں یہ بتانا چاہا ہے کہ ہماری کشتیِ حیات جو وقت کی لہروں پر رواں دواں ہے، اگر طوفانوں کا مقابلہ نہ کر سکے تو پھر ناکامی ہے اور ایسا علم جو مشکلات پر قابو نہ پا سکے، بیکار ہے، رومی نے یہ سبق شمس تبریز سے لیا ہے، جس نے کہا تھا کہ اگر علم معلوم یا منزل تک نہ پہونچا سکے، اس سے جہالت بہتر ہے، چنانچہ بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری یہ ساری بحثیں بے معنی ہو کر رہ گئیں ہیں اور چند الفاظ یا نعرے ہیں، جنہیں ہم بار بار دہرائے جا رہے ہیں، جس کی وجہ

---

[1] طاقت لندن ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۰

[2] ایضاً، ص ۲۵۸

[3] اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید (انگریزی)، لاہور، ص ۱۸۹

سے یہ الفاظ جو اپنے ساتھ عظیم الشان روایات رکھتے تھے، اپنی آب و تاب کھو بیٹھے ہیں، شاید اس لئے اقبال نے برطانوی مفکر ہوبز کے حوالے سے لکھا تھا کہ ایک خاص تسلسل اور انداز سے چند تصورات اور خیالات کو دہرانے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں نہ کوئی خیالات ہیں، اور نہ ہی افکار، افسوس! آج اکثر مسلمان قوموں کی نصیب میں یہی ہے، کہ وہ میکانکی طور پر پرانی قدروں کا ورد کر رہی ہیں، جب کہ ترک نئی قدروں کی تخلیق کی راہ پر گامزن ہے ؁، غرضیکہ ہمیں سختی سے خود اپنے افکار کا جائزہ لینا چاہیے، اس تنقیدی محاسبے کے بعد ہم یقیناً کسی مفید نتیجے پر پہونچ سکیں گے، لیکن اپنے محاسبے کے لئے انسان کا خود اپنی گھات میں بیٹھنا زندگی کا مشکل ترین کام ہے

یہاں اگر ماوردی، غزالی اور ابن خلدون کے نظریات دہرائے جائیں تو اس کا شاید چنداں فائدہ نہ ہو، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان تصورات کی بنیاد پر خود ان کے اپنے عہد میں ریاست قائم نہیں ہوئی، اس امر سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، ہمیں ایک ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہے جو ہماری امنگوں آرزؤں اور روایات کا حامل ہو یہاں یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ان روایات میں مذہب سرِ فہرست ہے، لیکن ہم اسے کیوں کر عملی شکل دے سکتے ہیں، اس پر بحث ہونی چاہیئے چنانچہ پرانے مفکرین کے خیالات کو دہرانے کی بجائے ہم یہاں صرف چند اصولی باتیں کریں گے. وہ بھی اپنے معاشرے کے حوالے سے، سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام کا ہم سے کیا تقاضا ہے! نیز ہماری مذہبی زندگی میں عقل اور تجربے کا کیا رول ہے، قرآن مجید اور سنتِ رسول ؐ کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اسلام دو باتوں کا حکم دیتا ہے،

۱، انسان کو اپنا تعلق خدا سے قائم کرنا چاہیئے یہ تعلق جس قدر مضبوط ہوگا، اسی قدر آدمی کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہوگا اس تعلق کو قائم کئے بغیر انسانی روح کو کبھی قرار نہیں ملے گا مزید یہ کہ انسان اپنی باطنی اور معنوی خامیوں پر اسی تعلق کی بناء پر قابو پا سکتا ہے، مثلاً قانون جو اجتماعی زندگی کا ایک مظہر ہے، ہماری باطنی زندگی پر کنٹرول نہیں رکھتا، یعنی ہم قانون کے ذریعے، حسد نفرت یا جھوٹ جیسی خطرناک بیماریوں پر قابو نہیں پا سکتے، ان بیماریوں کا مداوا خدا کے ساتھ تعلق کا قائم کرنا ہے جوں جوں خدا اور انسان کے باہمی تعلق کا احساس بڑھتا ہے اسی قدر انسانی فکر و نظر اور قول و فعل میں پاکیزگی آتی جاتی ہے، اور اس طریق سے آدمی اجتماعی زندگی میں ایک بہترین ممبر بنتا ہے شام میں حضرت عمرؓ کے کمانڈر ابو عبیدہ نے حمص سے اپنی فوجوں کی واپسی پر اہلِ کتاب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے تم سے تمہارے دفاع کے نام پر جو ٹیکس لیا ہے اسے واپس کرتے ہیں، کیونکہ ہم اس علاقے کو چھوڑ رہے ہیں اگر ہم واپس ہوئے تو پھر تم سے معاہدہ کریں گے، ابو عبیدہ کا ٹیکس لے کر واپس کر دینا اخلاقی پاکیزگی کی ایک بلند مثال ہے اس شریفانہ برتاؤ کو دیکھ کر اہل کتاب نے کہا کہ خدا تم جیسے لوگوں کو واپس لاتے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے قرآن مجید کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا، قرآن کا بنیادی مقصد جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، انسان اور خدا اور ایسے ہی انسان اور کائنات کے باہمی رشتے کے بارے میں بلند شعور پیدا کرنا ہے ؁ اقبال نے مزید کہا ہے کہ اسلام میں قانون کا سرچشمہ قرآن مجید ہے، لیکن یہ لیگل کوڈ نہیں ہے

۲:- اجتماعی زندگی میں اسلام نے شریعت کے نام سے ایک قانون دیا ہے یہ قانون اخلاقی بنیادوں پر ہے یہاں اخلاقی بنیادوں سے مراد ایسی قدریں ہیں، جن کی بنیاد وحی پر ہے، مثلاً موجودہ وقت میں مرد اور عورت کے آزاد تعلقات، بشرطیکہ جبر پر مبنی نہ ہوں، جدید قانون کی نگاہ میں جائز شمار ہوتے ہیں، لیکن اسلام اسے ایک برائی قرار دیتا ہے، در اصل ہم اس مفروضہ کو کہ "جو چیز سوسائٹی کے لئے مفید ہے اچھی ہے"، تسلیم نہیں کرتے، بہر نوع ہمارا اخلاقی ضابطہ ایسا ہے، جس کی ہمیں، اجتماعی اور انفرادی زندگی میں پیروی کرنی ہوگی، یہ کوئی جز وقتی ضابطہ نہیں ہے جہاں تک تعلق تمہاری سیاسی

؁ تشکیلِ جدید، ص ۱۶۲ ؁، ایضاً، ص ۱۶۵

زندگی کا ہے، تو اس کے بارے میں نہایت اختصار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے سیاسی زندگی کے لئے کوئی خاص نظام نہیں دیا، بلکہ چند عالم گیر اصول مثلاً مساوات، آزادی اور عدل، جو دراصل توحید کا منطقی نتیجہ ہیں۔ دیکر اسے انسانی عقل اور تجربے پر چھوڑ دیا ہے، مگر اس کا معنی یہ نہیں کہ عقل اپنے تجربوں میں وحی سے بالکل بے نیاز ہو جائے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ عقل وحی کی روشنی ہی میں دیکھ سکتی ہے، جس طرح کہ انسانی آنکھ کا ہونا بھی ضروری ہے اسی طرح عقل کا جو وحی کی طرح خدا کا عطیہ ہے، استعمال ضروری ہے اور دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے مغربی سیاست کی بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اپنی پوری کامیابیوں خوبیوں کے باوجود اخلاقی اقدار اور وحی سے بے نیاز ہے۔ جس کی بنا پر وہ انسانی مشکلات میں اضافہ کا موجب بنی ہے۔ چنانچہ زندگی کے جن امور میں وحی نہیں آتی تھی، ان کے بارے میں رسول کریمؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کئے، یعنی روزمرہ کی زندگی کے مسائل میں آپ اپنے ساتھیوں سے مشورہ فرماتے یہ مشورہ فرمانا اس بات کی دلیل تھا کہ لوگوں کو زندگی کے مسائل میں اپنی عقل کو استعمال کرنا چاہیئے، آپ کی رحلت کے بعد پہلے خلیفہ راشد کا انتخاب کیا گیا، یہ انتخاب صحابہ کرام رضؓ نے اپنی صوابدید سے کیا، اس انتخاب نے یہ بھی بتا دیا کہ جو معاشرہ انتخاب کا حق رکھتا ہے، وہ صدر ریاست کو برطرف بھی کر سکتا ہے، نیز یہ کہ انتظامی امور میں عقل و دانش کی فرمانروائی ہے، لیکن اس سیاسی اور انتظامی امور میں بنیادی نصب العین یہ تھا کہ معاشرے کے مفاد کو جس کا تحفظ عدل و انصاف کے قیام ہی سے ہو سکتا ہے، ہر قیمت پر مقدم رکھا جائے، چنانچہ اس نصب العین تک پہونچنے کے لئے خلیفۂ اول اور دوم نے اپنے وقتوں میں جو قدم اٹھائے وہ اختلاف وقت کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف تو ہو سکتے ہیں مگر دونوں کی منزل ایک تھی، یعنی عدل و انصاف کا قیام اور انسانی وقار و ناموس کا تحفظ، سوسائٹی میں عدل و انصاف کے قیام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، کہ بعض مسلم مفکرین نے غیر مسلم انصاف پرور حکمران کو ظالم مسلم حکمران سے بہتر گردانا ہے ایسے ہی ایک حدیث میں آیا ہے۔ کہ ملک کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتا ہے، لیکن ظلم کے ساتھ نہیں چل سکتا،

بہر نوع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اجتماعی زندگی کے نظم و نسق اور ریاستی امور کو چلانے کے لئے جو کچھ کیا اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے:

۱- اظہار رائے کی آزادی، ہر شہری، ریاستی اور دنیاوی امور میں بے خوف و خطر اپنی رائے کا پوری آزادی سے اظہار کر سکتا تھا،

۲:- باہمی مشاورت، خلیفہ یا صدر ریاست کا انتخاب باہمی مشورے سے ہوا۔ لیکن یہ انتخاب کرنے والے خود بھی علم و فضل سے آراستہ تھے، یہ انتخاب اس بات کی دلیل تھا کہ انتظامی امور جن میں کہ وحی خاموش ہے، عقل کے دائرہ کار میں آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صدر ریاست کو کبھی "خدائی اختیارات" کا حامل تصور نہیں کیا گیا، وہ قوم کے سامنے جواب دہ تھا،

۳- قانون کی حکمرانی، اسلام میں ریاست کی امتیازی خصوصیت، جمہوریت، دستوری بادشاہی یا انتظامی ڈھانچے کو نہیں یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت ریاست میں قانون کی سیادت ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ ہمارے قانون کی بنیاد اخلاقی قدریں ہیں۔ لیکن آج یہاں معاملہ بالعکس ہے، یعنی ہم قانون کی مدد سے انسان کو اخلاقی بنانا چاہتے ہیں حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا، واقعہ یہ ہے کہ انسان قانون پر انسان پر ظلم کرتا ہے، ابوالکلام آزادؒ نے اس امر کی طرف اپنے مخصوص انداز میں اشارہ کیا ہے:

"انسانی قتل و غارت گری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں میدان ہائے جنگ کے باہر کون کون سی رہی ہیں، تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے نام سے قائم کی گئیں۔"

۴۔ ملت کا مجموعی مفاد ہماری سیاست کا بنیادی نکتہ ہے، اس مجموعی مفاد ہی میں مشیتِ ایزدی کام کرتی ہے لیکن مجموعی مفاد کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسروں کو اپنا غلام بنائیں، اور ان کی محنت پر دادِ عیش دیں جیسا کہ تمدن کے نام پر سرمایہ دارانہ نظام نے کیا یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفکرین نے ریاست کے فرائض میں جان، مال، آبرو اور دین کا تحفظ قرار دیا ہے۔

آج ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ہم نے اپنے سیاسی استحکام کے لیے ان اصولوں کو اختیار کیا، اور ایسا سیاسی نظام تیار کیا جس میں ملک کے بسنے والے تمام شہری برابر کے شریک ہوں، افسوس کہ ہم یہاں ایسا نہ کر سکے، فکر و نظر کی آزادی کو سلب کیا گیا، جمہوریت کی راہ ترک کی گئی، قانون سرِبازار رسوا کیا گیا، اس کوتاہی کی ذمہ داری ہماری سیاست پر ہے جو اخلاق سے یک قلم عاری ہے، لیکن اپنے مفاد کے لئے اخلاق، اسلام اور مذہب کا نام ضرور استعمال کرتی ہے اور جب کبھی ہماری سیاست ناکام ہوئی اور اسے ہونا بھی چاہئے تھا، تو اس نے اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مذہب کا سہارا لیا، اور لوگوں کی توجہ کو بنیادی مسائل سے ہٹانے کی کوشش کی، حتیٰ کہ ہم اپنے ملک کے ایک حصے سے دست بردار ہو گئے، ملکی وحدت کے خلاف یہاں جو طاقتیں کام کر رہی تھیں، اور جس انداز سے جذبات کو برانگیختہ کیا گیا، اس کی طرف ماضی میں توجہ نہیں دی گئی، مثلاً ۱۹۵۳ء میں مجیب الرحمٰن نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں اردو زبان لازمی قرار دی گئی ہے جب کہ مغربی پاکستان میں بنگالی زبان نہیں ایسے ہی ۱۹۵۶ء میں مسٹر سہروردی نے مخلوط انتخابات کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو مشرقی پاکستان مغرب سے الگ ہو جائے گا، یا ۱۹۶۸ء میں ایک کتاب "آگ کا دریا" لاہور سے شائع ہوئی، جس میں صاف طور پر یہ کہا گیا کہ مشرقی پاکستان مغرب سے الگ ہو جائے گا، اور خود مغرب والے بھی یہی چاہتے ہیں، یہ صرف چند مثالیں ہیں، لیکن نہ تو ہمارے دانش ور طبقے اور نہ ہی اربابِ سیاست نے ان باتوں کا سنجیدگی سے کوئی نوٹس لیا، بلکہ ان باتوں کے جواب میں کہا گیا کہ مشرق اور مغرب کو کوئی الگ نہیں کر سکتا، سہروردی صاحب فریب میں مبتلا ہیں واقعہ یہ ہے، کہ تاریخ کے بناؤ یا بگاڑ میں کام کرنے والے محرکات کا ادراک کئے بغیر کوئی قوم سیاسی استحکام حاصل نہیں کر سکتی یا چند نعروں یا طاقت کے زور پر انسانوں کے دل و دماغ میں حرکت کرنے والے خیالات کو دبایا نہیں جا سکتا، چنانچہ ۱۹۷۱ء کا سیاسی بحران پیدا ہوا، اور بنگال کا علاقہ پاکستان سے باہر نکل گیا جن لوگوں نے بنگال اور سلہٹ کو پاکستان میں شامل کرنے کے لئے کام کیا، وہی لوگ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ان علاقوں کو پاکستان سے باہر نکال کر لے گئے، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ملک میں جمہوری نظام نہیں تھا، جس میں سب لوگوں کو شریک اقتدار ہونے کا احساس ہوتا اور کھل کر بات کرنے کی آزادی ہوتی، یہی احساس محرومی تھا، جس نے ہمیں نقصان پہونچایا، اس کا سیدھا سادا علاج اس احساس کو دور کرنا تھا، لیکن ہم نے اسے دور کرنے کی بجائے "خیانت و غداری" کی چند اصطلاحات کے ذریعہ کام چلانا چاہا نتیجے میں تاریخ نے اپنا فیصلہ ہمارے خلاف دیا، موجودہ وقت میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ پاکستان کے تمام لوگوں کو شدت سے شریک اقتدار ہونے کا احساس ہونا چاہئے اور جو عوامل ہمارے خلاف کام کر رہے ہیں ان پر نہایت صبر و تحمل کے ساتھ بحث ہونی چاہئے کیونکہ زندگی کے ہر مسئلہ کو اس کے صحیح تناظر ہی میں دیکھنا چاہئے جس سے میری مراد یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام ہوئے، تو اس ناکامی کے اسباب کا سراغ لگانا، لیکن اپنی ناکامیوں کے صحیح اسباب کا پتہ لگانے کی بجائے کسی مذہبی نعرے کا سہارا نہیں لینا چاہئے، افسوس کہ ہم ادھر تیس سال سے اپنے مسائل کا حل انہی نعروں کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت فیل ہوئی، تو خلافت کمیٹی کے ممبروں نے یہ طے کیا کہ وہ ایک دوسرے کو صبح کی نماز کے وقت گھر گھر جا کر بیدار کریں گے، اس پر حسرت موہانی نے کہا کہ کوئی آدمی میرے گھر پر نہ آئے یاد رہے کہ موہانی صوم و صلوٰۃ کے بڑی سختی سے پابند تھے، موہانی کے کہنے کا مطلب یہ تھا، کہ ہمیں اپنے سیاسی مسائل سیاست ہی کے سیاق و سباق میں سلجھانے چاہئیں، چنانچہ پاکستان کے سیاسی مسائل کا حل سیاسی انداز ہی سے

ہو سکتا ہے یہ جو بار بار خدا کی حاکمیت کا اعلان کیا جاتا ہے، اس پر بھی سوچنا چاہیئے کہ مسلمان تو اللہ کی مشیت اور حاکمیت کو تسلیم کئے بغیر مسلمان ہی نہیں ہو سکتا، واقعہ یہ ہے کہ مذہب چند بو جہل عقائد یا سائنسی انداز فکر کا نام نہیں یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو انسان کو نئی زندگی عطا کرتا ہے، چنانچہ ایک مسلم ریاست میں بار بار اللہ کی حاکمیت کا اعلان تحصیلِ حاصل ہے خود ہماری تاریخ میں اس نعرے کو سب سے پہلے خوارج نے بلند کیا اور اس کے نتیجہ میں حضرت علیؓ جیسے خلیفہ راشد اور مقدس انسان کو شہید کر دیا گیا، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی سیاسی ناکامیوں پر مذہبی نعروں سے پردہ نہیں ڈال سکتے، اس سے نہ صرف ہماری مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ مذہب کا مقدس نام بھی بدنام ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ پڑھتے وقت مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف جانا چاہیئے، لیکن ہم آج مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف آرہے ہیں، میری مراد یہ ہے کہ ہم ریاست سے دین کی طرف آرہے ہیں، چنانچہ آج ہمیں قیاسی بحثوں اور بے نتیجہ تقریروں سے الگ رہ کر غور و فکر کی راہ اختیار کرنا ہوگی، اور یہی وہ راہ ہے جس کا سراغ خود مذہب نے ہمیں دیا ہے، چنانچہ ہمیں حقائق کی دنیا میں رہ کر عقل، مشاہدے تجربے کی بنیادوں پر اپنے مسائل حل کرنے چاہئیں، ڈاکٹر اقبال نے ایک جگہ کہا ہے، کہ نہ صرف ایشیا بلکہ قدیم تہذیبیں اس لئے ناکام رہیں کہ انہوں نے تلاشِ حقیقت کے لئے داخل سے خارج کی طرف قدم اٹھایا تھا[۵۶] اس سے مقصد یہ تھا کہ جس فکر کے پیچھے عمل نہیں ہے یا مشاہدہ اور تجربہ نہیں ہے وہ فکر سود مند نہیں، ابن قیمؒ نے بھی کہا تھا کہ یہ کہنا کہ جو شرع کہے وہی سیاست ہے غلط ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے، کہ سیاست وہ ہے، جو شرع کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو، شاطبی نے بھی یہی کچھ کہا تھا کہ مابعد الطبعیات کا تعلق وحی سے ہے اور دنیاوی امور کا تعلق عقل تجربے اور مشاہدے سے، چنانچہ ہمیں اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ وقت کسی خاطر اپنی رفتار نہیں بدلتا اور دل پر ہاتھ رکھ کر تاریخ کو پڑھنے سے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا، چنانچہ اگر ہم نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو تاریخ کا فیصلہ کل کو پھر ہمارے خلاف ہو سکتا ہے چنانچہ ہم اپنے سیاسی استحکام میں اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں، جب ہم عقل و دانش کی راہ اختیار کریں، اور ان اصولوں کو عملی جامہ پہنائیں جن کی تلقین قرآن مجید، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے کی ہے یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان اصولوں کی تلقین تو موجودہ وقت میں دونوں ممتاز فلسفہ ہائے سیاست بھی کر رہے ہیں، یا یہ کہ سویڈن، برطانیہ، اور دوسرے ملکوں میں ہر شہری کو ریاست کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے اور وہاں قانون کی مکمل حکمرانی ہے،

ہماری سیاست کا اب امتیازی وصف کیا ہے؟ اس کے جواب میں نہایت ہی اختصار سے یہ کہا جا سکتا ہے، کہ دنیا کے جس حصے میں بھی انسان کی فلاح و بہبود کے لئے عدل و انصاف کو قائم کیا گیا ہے، ہم از روئے قرآن ان کی تائید کرتے ہیں ابن تیمیہ نے قبرص کے عیسائی بادشاہ کو خط لکھتے ہوئے کہا تھا کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں، جو تمام انسانوں کے لئے بھلائی کی خواہاں ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ موجودہ فلسفہ ہائے سیاست خالص عقل کے مرہونِ منت ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کی مشکلات کو حل نہیں کرنے پائے، مثلاً مغربی جمہوریت کی بنیاد فلسفہ انفرادیت پر ہے، جو بالآخر سرمایہ داری پر منتج ہوا اور سرمایہ داری کے ہاتھوں ہم نے اس صدی میں جو مصیبتیں اٹھائی ہیں، اس سے ہر کوئی واقف ہے، اس کے برعکس دوسرا فلسفہ فلسفہ اجتماعیت پر مبنی ہے، جو بالآخر ڈکٹیٹر شپ کی شکل اختیار کر گیا ہے، اور فرد کی کوئی قیمت نہیں رہی، ان دونوں فلسفوں کو جانچنے کے بعد اسلامی فلسفۂ سیاست کی نمایاں خصوصیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں کے بین بین ہے، یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے، کہ آزادی، مساوات اور عدل و انصاف سے متعلق ہمارے تصورات ماورائی ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جماعتی مفاد کی بڑی تاکید کی گئی ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ فرد کو بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ حکمران کا

۵۶ تشکیلِ جدید (پہلا خطبہ)

تو یہ کرتے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہم ریاست یا سیاست کی راہ سے ایک ایسے معاشرہ کی راہ ہموار کر رہے ہیں، جس کا منتہائے نظر مادی خوشیاں ہی نہیں رہیں، بلکہ اخلاقی تربیت بھی ہے، ایسی اخلاقی تربیت جو آخرت میں جواب دہی کے احساس پر قائم ہے۔ اس ساری بحث کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری سیاست کا منتہائے نظر خدا کی عظمت اور انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ہے۔

****

بچوں کا صفحہ



انتظار حسین اسعد

★★

پیارے بچو! روزہ ایک اہم عبادت ہے۔ جس کا حکم قرآن اور احادیث میں بکثرت آیا ہے۔ اور اس کے بہت سے دینی دنیوی اور اخروی فوائد ہیں۔

روزہ سے خدا کا ایک فریضہ ادا ہو جاتا ہے، حق تعالے کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ ہر نیکی کئی درجے بڑھ جاتی ہے، فرشتوں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ خدا کے ساتھ خاص تعلق اور قرب پیدا ہو جاتا ہے۔ نفلی عبادات سے فرض کا ثواب ملتا ہے۔ اور فرض عبادت کا ثواب ستّر گنا بڑھ جاتا ہے۔ دل کی کثافت دور ہوتی ہے۔ روزہ شیطان کے حملوں سے بچاؤ کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے، نماز اور خیرات کی عادت پڑتی ہے۔ خدا کی رحمت سے خاص حصہ ملتا ہے۔ روزہ دار خدا کو اپناتا ہے اور خدا اس کا بن جاتا ہے۔ گناہوں کا بازار ٹھنڈا ہو جاتا ہے، مساجد کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ روزہ بے ریا عبادت ہے۔ اس سے سکونِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ دعا قبول ہوتی ہے۔ خیالات پاکیزہ رہتے ہیں۔ روحانیت بڑھتی ہے۔ روزہ رحمت بخشش اور نجات کا باعث ہے۔ اجتماعی عبادت سے لذت آتی ہے۔ انفرادی عبادت کا زیادہ موقعہ ملتا ہے، اپنے نفس کا احتساب کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، تراویح کا ثواب ملتا ہے، لیلۃ القدر نصیب ہوتی ہے جس کا ثواب ایک ہزار ماہ کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔ عید الفطر کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ صبح سویرے اٹھنے کی عادت پڑتی ہے۔ صبح کی بیداری سے جوشِ عمل بڑھتا ہے۔ محنت کے لیے وقت زیادہ ملتا ہے۔ جفاکشی کی عادت پڑتی ہے۔ وقت پر کھانے بسیار خوری رکتی ہے۔ معدے کو تقویت پہنچتی ہے۔ موٹاپا دور ہوتا ہے۔ روزہ بھی ایک جسمانی ورزش ہے، خون کا دباؤ درست ہوتا ہے۔ بھوک زیادہ بڑھتی اور بیماری گھٹتی ہے، اندرونی اعضاء کو تقویت پہنچتی ہے۔ سنگدلی دور ہوتی اور نرم مزاجی آتی ہے۔ صبر و شکر نصیب ہوتا ہے اور دوسروں کی بھوک اور پیاس کا احساس ہوتا ہے۔ رزق میں کشائش ہوتی ہے۔ آخرت میں روزہ بہشت کا ضامن ہوگا۔ جنت کے دروازے "ریان" سے داخلہ ہوگا۔ روزہ قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔ روزہ دار کو عرش کے نیچے سایہ ملے گا۔ خدا کا جلوہ نصیب ہوگا۔

پیارے بچو! آپ کو بھی چاہیے کہ اس مہینہ کا بہت زیادہ احترام کریں۔ اگر روزہ نہ رکھ سکیں تو دوسرے کے سامنے کوئی چیز کھانے پینے سے پرہیز کریں اور چھپ کر کھائیں۔ روزہ رکھنے کی ابھی سے عادت ڈالیں کہ اس کے بہت زیادہ فوائد ہیں۔ جو اوپر آپ پڑھ چکے ہیں۔

خدا عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین!!